انسانِ کامل و نبی اکمل صلی اللہ علیہ وسلم

ڈاکٹر منظور ممتاز

انسانِ کامل و نبیِ اکمل صلی اللہ علیہ وسلم

ڈاکٹر منظور ممتاز

مکتبہ تعمیر انسانیت
اردو بازار
لاہور

۲۹۷/۹۹۳۱
م ۲۸ ممن
۷۸۳۳۲

جملہ حقوق بحق مصنّف محفوظ

طابع : محمد سعید اللہ صدیق
مطبع : زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
طبع : اول ۱۹۹۴ء
سرورق : تنویر مرشد
قیمت : ۱۵۰ روپے

پیش لفظ

انسان کے لکھنے پڑھنے کی ابتدا سے اب تک کوئی انسان ایسا نہیں گزرا جس کے سوانح و سیرت سے متعلق دنیا کی مختلف زبانوں میں اس قدر لکھا گیا ہو جس قدر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔

اُردو اس معاملے میں کسی بھی زبان سے پیچھے نہیں رہی۔ اس میں حضورؐ سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے۔ اس میں ابن ہشام کی ضخیم سیرت النبیؐ کا ترجمہ بھی ہے اور مولانا شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی لکھی چھ جلدوں پر مشتمل سیرت النبیؐ بھی موجود ہے، جس میں حضورؐ کی زندگی کے ہر پہلو پر بڑی شرح و بسط سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ سیرت النبیؐ کے بعد قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی تین جلدوں پر مشتمل رحمۃ للعالمینؐ، سیرت طیبہ میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ سیرت کی ان کتب کو پڑھ لینے کے بعد عرب کے اُس وقت کے معاشرے اور حضورؐ کی زندگی کے تقریباً سبھی پہلو سامنے آ جاتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ایک ایسے بے داغ صد پہلو الماس کی سی ہے، جس کے ہر ہر پہلو سے نور کے دھارے پھوٹتے ہیں، اور نور کے ان دھاروں پر انسان جوں جوں غور و خوض کرتا ہے علم و عرفان کے دروازے اُس پر کھلتے چلے جاتے ہیں اور پھر جب وہ اُس علم و عرفان کو تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہے تو اُس کا ذخیرۂ الفاظ اُسے احاطہ کر نہیں پاتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر ابنِ اسحاق اور ابنِ ہشام سے لے کر گزشتہ

قریباً ساڑھے تیرہ سو برس میں مختلف زبانوں میں اس قدر لکھا جانا، بذاتِ خود اس بات کا بیّن ثبوت کہ انسانوں میں سے ایک انسان ایسا بھی تھا، اور ہے کہ جس کی ذاتِ کامل و اکمل پر جس قدر بھی لکھا جائے، کم ہے، اور انسانیت اُس کی صفاتِ عالیہ پر جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔

مولانا شبلی نعمانی / سیّد سلیمان ندوی کی سیرتُ النبیؐ اور قاضی محمّد سلیمان کی رحمۃُ للعالمین اور پھر زمانۂ حال کی مولانا مودودی کی سیرتِ سرورِ عالمؐ کے بعد سیرت پر تفصیل سے کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہو گی، لیکن جیسا کہ عرض کیا کہ صد پہلو الماس سے پھوٹتے نور کے دھارے ایسے بحرِ ناپیدا کنار ہیں کہ جنہیں کسی بھی انسان کا قلم احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ اس لیے ہر سیرت نگار اُسی قدر صفحۂ قرطاس پر منتقل کر پاتا ہے، جس قدر کہ اُس کے بس میں ہے اور بس!

علم کی سب سے بڑی ڈگری گو کہ میرے پاس ہے، لیکن میں عالم نہیں، گو کہ میں مسلمان ہوں لیکن اُن مومنین میں سے نہیں، جن کی کتابُ اللہ میں تعریف کی گئی ہے، میں تو بس ایک کم علم مسلمان ہوں، لیکن آقائے نامدارؐ کے غلاموں کی صف میں شامل ہونے کا متمنّی ضرور ہوں۔ یہ تمنا برسہا برس سے میرے سینے میں رچی بسی رہی ہے اور اسی تمنا نے شوق نے میرے قلم کو حرکت دی ہے اور اپنے اُس قلیل علم کو کام میں لایا ہوں، جو مجھے عطا کیا گیا ہے کہ علمِ کامل کا رکھنا والا تو اللہ ہی ہے اور اُس کے علمِ کامل سے وافر ترین حصہ پانے والا اُس کا نبیِ اکملؐ ہی ہے، اور علم کی عطا کی جانے والی فراوانی ہی تھی جس کی بنا پر اللہ نے اپنے اعلیٰ ترین بندے سے متعلق فرمایا " وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ "، جس کے ذکر کی ہمہ گیری و عظمت کی شہادت خالقِ کائنات نے دی ہو، اُس کے ذکر میں لمبی چوڑی بات کرنا بھی بس ایک بات ہی ہے۔

سیرتُ النبیؐ اور رحمۃُ للعالمینؐ کے پڑھنے سے اور پھر بعد میں سیرتِ سرورِ عالمؐ کے کئی دو دو پر دو ضخیم ترین جلدوں کے مطالعے سے میرے دل میں یہ تمنا بڑی شدت سے اُبھری کہ سیرت کی مختصر و جامع کتاب اُردو میں ایسی ہونی چاہیئے، جس کے مطالعے سے حضورِ پُر نورؐ کی زندگی کے تمام پہلو سامنے آ جائیں اور اُن الزامات کے مختصر جواب بھی اُس میں موجود ہوں جو

مغرب کے نام نہاد سوانح نگار متعصب عیسائیوں اور یہودیوں وغیرہ نے اسلام اور حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر لگائے ہیں۔

بھاگ دوڑ، عدیم الفرصتی اور نفسا نفسی کے اِس زمانے میں سیرت کی ضخیم کتب کے لیے وقت اور رقم نکالنا ایک عام مسلمان کے لیے مشکل ہو گیا ہے کہ زندگی کے میدانِ عمل میں قدم رکھتے ہی وہ سرپٹ دوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے گو کہ اکثر و بیشتر مجبوریاں اُس کی اپنی ہی پیدا کردہ ہوتی ہیں مگر ہیں ضرور۔ آج کے اس دور میں رزقِ حلال سے اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ پالنا ہی ایک بڑا مسئلہ بن کر رہ گیا ہے جو کہ پاکستان بننے سے قبل بلکہ پچیس تیس برس پہلے اتنا بڑا مسئلہ نہ تھا۔

سیرت کی یہ مختصر سی کتاب اِس نیت سے لکھی گئی ہے کہ ضخامت اور قیمت میں کم ہونے کی بنا پر زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہنچے، اور زیادہ سے زیادہ قلوب انسانِ کامل و نبیِ اکملؐ کے اُسوۂ حسنہ سے فیض یاب ہوں، جو بنی نوعِ انسان میں سب سے اعلیٰ ہے کہ اُس سا اعلیٰ و ارفع نہ کوئی پیدا ہوا، اور نہ کوئی پیدا ہی ہوگا۔

میری اس نیت میں ایک نیت اور بھی پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ میری یہ کتاب میرے والدین میرے اساتذہ اور میری سُرخروئی اور بخشش کا سامان بھی بن جائے —— اللہ جو کہ نیتوں کا بہترین جاننے والا ہے اور بندۂ گناہ گار جو کہ اُس کے فضل و کرم، جود و سخا پر یقینِ کامل رکھنے والا ہے اپنے رب سے مُتوقّع ہے کہ وہ تعالیٰ اپنے حبیبؐ کی عظمت و بزرگی، علم و دانائی، عزت و عصمت اور صدق و سخاوت سے متعلق لکھی جانے اِس تحریر کو شرفِ قبولیت بخشے گا، اور اِسے میرے والدین، اساتذہ اور میری بخشش و نجات کا ذریعہ بنا دے گا اور صرف اِسے ہی میرا توشۂ آخرت جان کر میرے گناہوں کی باز پرس سے بھی درگزر فرمائے گا ——

—— قارئین سے بھی درخواست ہے کہ وہ اِس پر آمین کہیں!

ڈاکٹر منظور ممتاز ایم۔اے۔ پی ایچ، ڈی

ذی قعدہ ۱۴۱۲ھ مئی ۱۹۹۲ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انسانِ کامل و نبیِ اکملؐ

۲۰[۱] یا ۲۲ اپریل[۲] ۵۷۱ء میں مکہ کے شہر، قریش کے قبیلے بنی ہاشم، عبدالمطلب کے گھرانے کی اُس بہو کے یہاں ایک بچہ جنم لیتا ہے، جو کئی ماہ سے بیوہ ہو چکی ہے۔ دادا اِس بچے کی پیدائش پر یوں مسرور ہے کہ جوان مرحوم بیٹے کی نشانی وجود میں آئی ہے اور ماں اِس لیے خوش ہے کہ بیوگی میں نرینہ اولاد ایک ایسی نعمت ہے، جس پر بیوہ اپنی اُمیدوں کے چراغ از سرِ نو جلانے لگتی ہے۔

ہر شہر میں ایسے بچے تو پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں، جن کے باپ، اُن کی آنکھ کھلنے سے پہلے ہی کسی جنگ کسی حادثے یا کسی بیماری کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہ کوئی ایسا عجیب واقعہ نہ تھا کہ جس کی بہت شہرت ہوتی۔ اُس وقت یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے ہی یتیم ہو جانے والا یہ دُرِ یتیم کبھی دنیا بھر کے یتامیٰ کا ملجا و ماوا، اور اُن کے حقوق کا سب سے بڑا علم بردار بننے والا ہے، سو یہ عام سا ایک واقعہ تھا، جو ظہور پذیر ہوا۔ مسلمان سیرت نویسوں نے اس واقعے سے متعلق بہت سی تفصیلات بیان کی ہیں کہ اِس عظیم بچے کی پیدائش پر ایوانِ کسریٰ کے کنگورے گر گئے اور

۱؎ سیرت النبی، علامہ شبلی نعمانی جلد اوّل ص ۱۷۲

۲؎ رحمۃ للعالمین، قاضی محمد سلیمان، منصور پوری حصہ اوّل ص ۴۰

ایران کے آتش کدوں کی آگ یک لخت بجھ گئی، مگر اس روایت پر مولانا ابوالکلام آزاد نے بڑی مدلل بحث کی ہے، اور اِسے قطعاً ناقابلِ اعتنا قرار دیا ہے [1]

ہو سکتا ہے ایسا ہی ہُوا ہو، لیکن اِن واقعات کو پایۂ ثبوت تک پہنچانا از حد مشکل یوں ہے کہ ایک طرف تو ایوانِ کسریٰ کے کنگوروں کے گرنے کی تاریخ و وقت کسی تحریر سے ثابت ہو، اور اِدھر اِس یتیم بچے کا اُسی تاریخ اور اُسی وقت پیدا ہونا بھی تحریراً ثابت ہو سکے، جو ممکنات میں اِس لیے نہیں کہ عبدالمطلب کے پیدائشی یتیم پوتے کا پیدا ہونا، اُس وقت ایسا عظیم واقعہ نہ تھا، جسے مکہ کے محدودے چند پڑھے لکھے لوگ تحریر کرتے، جب کہ مکہ کے لوگ کاغذ کے استعمال تک سے آشنا نہ تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے کے بادشاہوں کی اولاد کی تاریخ پیدائش کو بھی تحریر سے ثابت کرنا ناممکن سی بات ہے، تو پھر مکہ کے ایک خاندان میں پیدائشی یتیم کی تاریخ ولادت کا تحریری ثبوت کہاں سے میسّر آسکتا ہے، اِس لیے ایوانِ کسریٰ کے کنگوروں کے گرنے اور ایران کے آتش کدوں کے سرد ہونے کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے، ہم ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں۔

کچھ سیرت نگار یہ کہتے ہیں کہ قبیلہ ہوازن کی ایک عورت حلیمہ، اِس یتیم بچے کو برضا و رغبت رضاعت کے لیے قبول کر لیتی ہے، اور کچھ یہ تحریر کرتے ہیں کہ جب اُسے مال داروں کے یہاں سے کوئی بچہ رضاعت کے لیے نہ مل سکا، تو اُس نے مجبوراً عبدالمطلب کے پوتے ہی کو قبول کر لیا کہ خالی ہاتھ لوٹنے سے تو یہی بہتر ہے، اور پھر کسی کو یہ بات یاد رکھنے کی کیا ضرورت تھی کہ بچوں کو رضاعت کے لیے لے جانے والیوں میں سے کس کا جانور فربہ ہے اور کس کا لاغر اور اُس کمزور جانور پر سوار عورت کی گود میں لیٹے بچے کی برکت تھی، جس سے اُس کی لاغر سواری، توانا جانوروں کو پیچھے چھوڑتی آگے نکل گئی تھی اور پھر اُسی بچے کی خیر و برکت سے حلیمہ کی کمزور بکریاں وافر دودھ دینے لگی تھیں۔

---

[1] ولادت نبوی ناشر ادبستان، لاہور ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۲۲ تا صفحہ ۱۲۴

اکثر و بیشتر مسلمان دل و جان سے یہ قبول کرتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا ہوگا، جیسا کہ سیرت نگاروں نے بیان کیا ہے بلکہ اُس سے بھی بڑھکر ہوا ہوگا، جو اُن تک پہنچ نہیں سکا، مگر اُن کے پاس ایسا ثابت کرنے کے مستند ذرائع کون سے ہیں؟ آج ہم ایسے دور میں سانس لے رہے ہیں، جس میں آواز کانوں سے سنی اور تصویر آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے تو بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے۔ سیرت نگاروں کے پاس ان واقعات کو ثابت کرنے کے لیے اُس وقت کی تحریر ہے ہی نہیں، صرف تقریر ہے، وہ بھی بہت بعد کی۔

حضورؐ کے حلیمہ سعدیہؓ کے یہاں قیام کے بارے میں سیرت نگاروں میں اختلاف ہے۔ ابن اسحاق نے وثوق سے چھ برس لکھا ہے[1]، مگر قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے چار برس[2]، اور شاہ معین الدین ندوی نے دو برس[3]، بہرطور آپ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ چھ برس کی عمر میں آپؐ کو، آپکے والد جناب عبداللہ بن عبدالمطلب کی قبر کی زیارت کے لیے یثرب لے گئیں، جہاں حضور کی پیدائش سے پہلے ایک سفر تجارت میں انہوں نے وفات پائی تھی، اور دفن ہوئے تھے۔ آپ اپنی والدہ اور اُم ایمن کے ساتھ یثرب میں ایک مہینہ رہے ہجرت کے بعد بنی عدی بن نجار کی گڑھی کو دیکھ کر آپ فوراً اُسے پہچان گئے اور فرمایا "یہاں میں انصار کی ایک لڑکی انیسہ کے ساتھ کھیلا کرتا تھا، اور اپنے دادا کی ننھیال کے لڑکوں کے ساتھ یہاں اُترنے والے پرندوں کو اُڑایا کرتا تھا۔" دارالنابغہ کو دیکھ کر فرمایا "یہاں میں اپنی والدہ کے ساتھ اُترا تھا، اور اسی گھر میں میرے والد کی قبر ہے۔ میں نے بنی عدی بن نجار کے کنویں میں تیراکی کی خوب مشق کرلی تھی"[4]

---

[1] سیرت النبی جلد اوّل ص ۱۷۵

[2] رحمۃ للعالمین، حصہ اوّل ص ۴۱

[3] تاریخ اسلام حصہ اوّل ص ۱۴

[4] سیرت سرور عالم، جلد دوم ص ۹۹

واپسی کے سفر میں حضرت آمنہ بیمار ہو گئیں اور انہوں نے ابواء کے مقام پر وفات پائی اور وہیں دفن ہوئیں، اور اُمِّ ایمن، حضورؐ کو لے کر مکہ واپس پہنچیں۔ جس کا تذکرہ بھی خود آپؐ نے یوں فرمایا ہے۔ " عمرۂ حدیبیہ کے موقع پر جب آپؐ ابواء پر سے گزرے تو فرمایا " اللہ نے محمدؐ کو اپنی ماں کی قبر پر جانے کی اجازت دے دی ہے "[1]

مکہ لوٹنے پر آٹھ برس کی عمر تک آپؐ کے دادا جناب عبدالمطلب نے آپؐ کی پرورش کی۔ وفات کے وقت انہوں نے آپؐ کو اپنے بیٹے جناب ابوطالب کی کفالت میں دے دیا۔ اس عمر میں آپؐ نے اہلِ مکہ کی بکریاں اُجرت پر چرائیں، جس کا تذکرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا کہ " میں اہلِ مکہ کی بکریاں کچھ قراریط پر چرایا کرتا تھا "[2]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر جب بارہ برس کی ہوئی، تو جناب ابوطالب کو تجارت کے سلسلے میں ملک شام کا سفر پیش آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سفرِ شام کا تذکرہ اس لیے بہت ضروری ہے، کیونکہ سیرت کی قریباً سبھی کتب میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ عیسائی مؤرخین اور سوانح نگاروں نے تو اس واقعہ کا ذکر بڑی شدّومد سے اس لیے کیا ہے کہ وہ اس سے یہ ثابت کرنے پر تلے بیٹھے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے عقائد کی بنیاد بحیریٰ راہب کی تعلیم پر رکھی، نہ کہ قرآن پر، قرآن تو اُن کی نگاہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام ہے، نہ کہ وحی۔

عیسائی اور یہودی مؤرخین اور سوانح نگاروں کو ایسی بنیاد فراہم کرنے والے درحقیقت ماضی کے مسلمان سیرت نگار ہی ہیں، جنہوں نے مختلف روایات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بارہ برس کی عمر میں واقعی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملاقات کسی عیسائی بحیریٰ راہب سے ہوئی تھی اور اُس نے نہ صرف یہ کہا تھا کہ "یہ سید المرسلین ہیں، یہ

---

[1] سیرتِ سرورِ عالم جلد دوم صفحہ ۱۰۰
[2] سیرتِ سرورِ عالم جلد دوم صفحہ ۱۰۲

یہ سید العالمین ہیں، ان کو اللہ عنقریب رحمۃ للعلمین بنا کر مبعوث فرمانے والا ہے" بلکہ آپؐ کے چچا کو مشورہ بھی دیا کہ " اپنے بھتیجے کو اپنے وطن لے جاؤ اور یہودیوں سے اس کو بچاؤ"۔ [1]

اسی روایت کے بارے میں مولانا شبلی نعمانی مرحوم تحریر کرتے ہیں کہ " یہ روایت مختلف پیرایوں میں بیان کی گئی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جس قدر عام مسلمانوں کو شغف ہے، اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے۔ سر ولیم میور، ڈریپر، مارگیولوس وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں، اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے، اور جو نکتے اس نے بتا دیئے، اُسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقاید اسلام کی بنیاد رکھی۔ اسلام کے تمام عمدہ اصول انہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں ــــــ لیکن حقیقت یہ ہے کہ روایت ناقابلِ اعتبار ہے"۔ [2]

اسی روایت کے متعلق قاضی محمد سلیمان منصور پوری مرحوم لکھتے ہیں " بصریٰ میں بحیرہ راہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا کہ نبی موعود یہی نوجوان ہے، چچا سے کہا کہ اسے یہودیوں کے ملک میں نہ لے جاؤ۔ وہ اسے پہچان کر کہیں گزند نہ پہنچائیں۔ شفیق چچا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بصریٰ ہی سے واپس کر دیا۔ اس بارہ میں جو حدیث ترمذی میں ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ چچا نے واپس کرتے وقت آں حضرت کے ساتھ بلال کو بھیجا تھا۔ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ یہ صریح غلطی ہے۔ اوّل تو اُس وقت بلالؓ نہ ابو طالب کے پاس تھا، نہ ابوبکر کے پاس، دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ان دنوں موجود ہی نہ ہو ــــــ یہودی رسولِ موعود کے انتظار میں رہا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اُس کے آنے پر یہودیوں کو کافروں پر فتح و نصرت ہوگی۔ یہ اعتقاد اُن کا اُس وقت تک رہا، جب تک کہ حضور کی بعثت نہ ہوئی۔

---

[1] سیرتِ سرورِ عالم جلد دوم صفحہ ۱۰۶-۱۰۵

[2] سیرۃ النبی جلد اوّل صفحہ ۱۸۱-۱۸۰

اس آیت (یہ لوگ نبی کے آنے سے پیشتر کافروں پر فتح اُس کے ذریعہ پانے کی آرزو میں رہا کرتے، جب نبی ظاہر ہوا، اور اُنہوں نے پہچان بھی لیا، تب اِس سے منکر ہو بیٹھے) سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ بحیرہ راہب کا قول غلط تھا، کیونکہ اگر یہودی اس لڑکپن میں آں حضرت کو پہچان لیتے تو اپنے اعتقاد کے مطابق حضور کو اپنی فتح و نصرت کا دیوتا سمجھ کر نہایت خدمت گزاری کرتے، نتیجہ یہ ہے کہ راہب کی داستان ناقابلِ اعتبار ہے،،[1]

اسی روایت سے متعلق، سب سے پُر لطف اور ٹھوس استدلال مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کا ہے، اُنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے سفرِ شام اور بحیریٰ راہب کا واقعہ ساڑھے چار صفحات پر رقم کیا ہے، جس کا اقتباس قابلِ توجہ ہے کہ ،، ہمارے نزدیک یہ ساری باتیں اگرچہ اکابر اہلِ علم و روایت سے منقول ہیں مگر کئی وجوہ سے ناقابلِ قبول ہیں۔ اوّل تو یہ صریح قرآن کے خلاف پڑتی ہیں، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے ،، اور تم ہرگز اِس کے اُمیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی،،۔

(القصص - ۸۶)

،، تم نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ یہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے،،

(الشوریٰ - ۵۲)

یہ آیات اِس باب میں بالکل قطعی الثبوت ہیں کہ نبوّت کے منصب سرفراز ہونے سے پہلے آپؐ اِس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبی بنائے جانے والے ہیں، حالانکہ اگر ۱۲ برس کی عمر ہی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہو چکا ہوتا اور ۲۵ سال کی عمر میں اُس کی مزید تصدیق ہو گئی ہوتی، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ آپ اپنے اوپر کتاب کے نزول کی اُمید نہ رکھتے ـــــ قرآن مجید کے بعد یہ روایات اُن صحیح ترین روایات کے بھی خلاف پڑتی ہیں، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی کے نزول اور اُس پر آپؐ کی کیفیت اور حضرت خدیجہؓ سے آپ کی گفتگو کے متعلق منقول ہوئی ہیں۔ اُس وقت آپؐ پر جو کیفیت طاری

---

[1] رحمۃ للعالمین جلد اوّل صـ ۴۲-۴۱

ہوئی، وہ کیسے طاری ہوتی، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ۲۸۔ برس سے یہ جانتے ہوتے کہ آپؐ نبی ہونے والے ہیں؟" [1]

بارہ[۱۲] برس کی عمر میں بحیرئی راہب سے ملاقات کے واقعہ کے بعد جس کی حقیقت بیان ہو چکی ہے، دوسرا بڑا واقعہ پچیس[۲۵] برس کی عمر میں آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کا ہے، جو آپؐ کی زندگی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، لہٰذا اُس کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔

آٹھ[۸] برس کی عمر میں اپنے دادا عبد المطلب کی وفات کے بعد، جناب ابو طالب نے آپؐ کو اپنی کفالت میں لے لیا۔ ابو طالب کوئی مال دار آدمی نہ تھے اور مزید یہ کہ کثیر العیال بھی، شاید جناب ابو طالب کی تنگ دستی کے پیشِ نظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس زمانے میں اہلِ مکہ کی بکریاں اُجرت پر چرانا پڑیں۔ اس واقعہ کو مولانا مودودی نے مختصراً یوں بیان کیا ہے، آپؐ نے فرمایا "میں اہلِ مکہ کی بکریاں قراریط پر چرایا کرتا تھا" (قراریط، قراط کی جمع ہے، جو ایک دینار کے دسویں یا بیسویں حصے کو کہتے تھے)۔ اِس واقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول بھی دلالت کرتا ہے، ابو سلمہؓ بن عبد الرحمٰن کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیلو کے درختوں میں سے گزرے، تو آپ نے فرمایا کہ "اس کے جو پھل سیاہ ہو گئے ہوں، وہ توڑو کیونکہ جب میں بکریاں چرا تا تھا، اُس زمانے میں یہی پھل توڑا کرتا تھا"۔ [2]

یہ تو ثابت ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے کئی برس حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرائیں اور اِس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کہ "کوئی نبی ایسا نہیں گزرا، جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں" [3] یہ ثابت کرتا ہے کہ شبانی بھی انبیاء کی سُنت میں سے ہے۔

لڑکپن میں بکریاں چرانے کے بعد جوانی میں ۲۵۔ برس کی عمر کے لگ بھگ آپؐ

---

[1] سیرتِ سرورِ عالم جلد دوم صفحہ ۱۰۹-۱۰۸

[2] سیرتِ سرورِ عالم جلد دوم صفحہ ۱۰۲

[3] سیرتِ سرورِ عالم جلد دوم صفحہ ۱۰۲

تجارت کے پیشے سے منسلک ہو گئے، جس کا ذکر کم و بیش سیرت کی ہر کتاب میں ہے۔
حضرت خدیجہؓ نے (جو مکہ کی ایک پاکیزہ سیرت و صورت مالدار بیوہ تھیں، اور اپنا مالِ تجارت شام، عراق و یمن وغیرہ کو بھیجا کرتی تھیں) ذی الحجہ ۲۵ سنہ میلادی میں آپؐ کو ایک معاوضے کے عوض اپنا مالِ تجارت دے کر بھیجا۔ اِس سفر میں حضرت خدیجہؓ کا غلام میسرہ بھی آپؐ کے ہمراہ تھا۔ تجارت کے اِس پہلے ہی سفر میں اللہ نے خوب برکت دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت سا منافع کما کر لائے۔ حضرت خدیجہؓ نے بھی مقررہ سے زیادہ معاوضہ دیا۔ حضرت خدیجہؓ کا غلام اس سفر میں آپؐ کے ساتھ تھا، اُس نے آپؐ کی عادات و اطوار و معاملاتِ تجارت وغیرہ سے اپنی مالکہ کو آگاہ کیا، اور اِس طرح حضرت خدیجہؓ نے آپؐ سے شادی کا ارادہ کر لیا، اور یہ شادی اِس پہلے سفرِ تجارت سے واپسی کے قریباً تین ماہ بعد انجام پائی۔ اُس وقت آپؐ کی عمر ۲۵ برس اور حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی اور قریباً پچیس برس وہی آپؐ کی اکیلی بیوی رہیں۔ حضرت خدیجہؓ نے رمضان سنہ ۱۰ نبوی میں وفات پائی تو اُن کی عمر ۶۵ برس اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سنِ شریف پچاس برس تھا۔

بہت سے عیسائی اور کچھ دیگر مذاہب کے نام نہاد مؤرخین و سوانح نگاروں نے آپؐ کی کثرتِ ازواج سے متعلق زہر چکانی، دریدہ دہنی اور ہرزہ سرائی سے کام لیا ہے اور اسی سلسلے کی ایک کڑی لاہور کے ایک متعصب ہندو راج پال کی کتاب "رنگیلا رسول" بھی تھی جس کے ناشر کو لاہور ہی کے غازی علم الدین شہید نے جہنم وصال کیا تھا۔
عقلِ سلیم بجا طور پر یہ تقاضا کرتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کثرتِ ازواج پر معترض حضرات اِس حقیقت پر توجہ دیں کہ گرم ممالک کے باشندوں کی بھرپور جوانی کا زمانہ اٹھارہ بیس سے تیس پینتیس برس کی عمر تک کا ہوتا ہے، اُس کے بعد انحطاط کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے اور پچاس برس کے لگ بھگ ان ممالک کے اکثر و بیشتر مرد بوڑھوں میں شمار ہونے لگتے ہیں۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بھرپور جوانی سے پچاس برس کی عمر تک کا زمانہ ایک ہی

اور وہ بھی سن رسیدہ بیوی کے ساتھ گزارا۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت سودہؓ سے آپؐ کے نکاح ۵۰ء میلادی یعنی ۱۰ بعد بعثت میں مکہ میں ہوئے، لیکن حضرت عائشہؓ کی رخصتی ۲ھ میں ہوئی، جب آپؐ کی عمر قریباً ۵۵ برس کی تھی، گویا دوسری تمام ازواجِ مطہرات ۵۰ سے ۶۲ برس کی عمر میں آپؐ کے نکاح میں آئیں۔ ظاہر ہے یہ عمر جنسی جذبات سے مغلوب ہو کر نکاح کرنے کی نہیں ہوتی، اس عمر میں نکاح کے کئی اور اسباب و علل بھی ہو سکتے ہیں، جن پر ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔

حضرت خدیجہؓ[1] نے رمضان ۵۰ء میلادی میں انتقال فرمایا۔ ۵۳ء میلادی تک حضرت سودہؓ[2] بنت زمعہ اور حضرت عائشہؓ[3] بنت ابوبکرؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کیے، لیکن حضرت عائشہؓ کی رخصتی کم سنی کی بنا پر ۲ھ میں ہوئی۔ مدنی زندگی کے دس برس میں آپ نے حضرت حفصہؓ[4] بنت عمر فاروقؓ، اُم المساکین حضرت زینبؓ[5]، حضرت اُم سلمہؓ[6]، حضرت زینبؓ[7]، حضرت جویریہؓ[8]، حضرت اُم حبیبہؓ[9]، حضرت میمونہؓ[10]، حضرت ماریہ قبطیہؓ[11] اور حضرت صفیہؓ[12] سے نکاح کیے۔

حضرت خدیجہؓ[1] ۲۵ سے ۵۰ برس کی عمر تک آپ کی رفیقۂ حیات رہیں اور رمضان ۵۰ء میلادی میں انہوں نے انتقال فرمایا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بڑی صاحبزادیاں حضرت زینبؓ اور حضرت رقیہؓ بیاہی جا چکی تھیں، لیکن دو چھوٹی صاحبزادیاں حضرت اُم کلثومؓ اور حضرت فاطمہ زہراؓ کم سن تھیں، جن کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ آپؐ فرائض رسالت ادا کرنے کے سلسلے میں اُن دنوں طرح طرح کے خطرات میں گھرے ہوئے تھے، لہٰذا ایک بیوہ خاتون حضرت سودہؓ[2] سے نکاح کر لیا، تاکہ جب آپؐ تبلیغ دین کے لیے گھر سے باہر رہیں تو گھر کی دیکھ بھال بخوبی ہو سکے۔

حضرت عائشہؓ[3] سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح گو اُسی زمانے میں ہوا جس زمانے میں حضرت سودہؓ سے، لیکن رخصتی ہجرت کے ۲ھ میں ہوئی (ازواجِ مطہرات میں سوائے حضرت ماریہ قبطیہؓ کے) یہی کنواری اور سب سے کم سن تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اِن اقوال پر مسلمان یقینِ کامل رکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے

فرمایا کہ "مجھے خواب میں تم کو دو دفعہ دکھایا گیا اور کہا گیا کہ یہ آپ کی بیوی ہے"۔[1]
"جبریل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس حضرت عائشہ رضی کی تصویر سبز ریشم میں لائے اور آپ صلعم سے کہا کہ یہ دنیا اور آخرت میں آپ کی بیوی ہیں"۔ پس یہ انتخاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا نہ تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا تھا۔[2]

بقیہ نو[9] ازواجِ مطہرات پر نظر ڈالیں، تو جو حقائق ابھر کر سامنے آتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ حضرت حفصہ[4] رضی، اُمّ المساکین حضرت زینب[5] رضی، حضرت اُمّ[6] سلمہ رضی، سب کی سب بیوہ تھیں، جن کے خاوند غزوۂ بدر اور غزوہ اُحد میں مارے گئے تھے۔ یہ ایک طرح بیوگان کی پرورش تھی اور حضرت حفصہ رضی سے نکاح حضرت عمر فاروق رضی کی عزت افزائی بھی تھی۔ حضرت زینب رضی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھوپھیری بہن تھیں، جن کی شادی حضور صلعم نے اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی سے کر دی تھی، لیکن دونوں میں نبھا نہ ہو سکا اور طلاق ہو گئی تھی۔ یہ نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب جاہلیت کی اِس رسم توڑنے کو کیا کہ متبنیٰ، بیٹا ہی ہوتا ہے، دوسرے حضرت زینب رضی کی دل دہی بھی مقصود تھی کہ وہ اِس بات پر دلگیر رہتی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خانوادے کی ایک محترم خاتون کی شادی اپنے ایک آزاد کردہ غلام سے کر دی تھی۔ حضرت جویریہ[8] رضی، قبیلہ بنی مصطلق کے سردار حارث بن ضرار کی بیٹی تھیں، جن کا خاوند سافع بن صفوان، غزوۂ مریسیع میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ اِس غزوہ میں بہت سے لونڈی غلام گرفتار ہوئے تھے اور یہ حضرت ثابت بن قیس انصاری رضی کے حصہ میں آئی تھیں۔ اُنہوں نے اپنے عالی نسب ہونے کی بنا پر غلامی کو گوارا نہ کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی خاندانی عظمت اور موجودہ غلامی کی حالت پر توجہ دلا کر مدد چاہتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت بن قیس انصاری رضی کو اُن کے بدلے رقم ادا کر دی اور اُن سے نکاح کر لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی مصطلق

---

[1] سیرتِ سرورِ عالم جلد دوم صفحہ ۶۳۰

[2] سیرتِ سرورِ عالم جلد دوم صفحہ ۶۳۰

کے تمام لونڈی غلام مسلمانوں نے آزاد کر دیئے، کیونکہ اب اُن کے سردار کی بیٹی اُمہات المومنین میں شامل ہو گئی تھی۔

حضرت اُمِّ حبیبہؓ اپنے خاوند عبید اللہ بن جحش کے ساتھ دوسری ہجرت میں حبشہ گئیں، بعد میں اُن کے شوہر نے عیسوی مذہب اختیار کر لیا، لیکن یہ خود اسلام پر قائم رہیں اور خاوند سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلمؐ نے اُنہیں حبشہ ہی میں نکاح کے لیے پیغام بھجوایا تھا، شاہِ حبشہ نجاشیؓ نے مہر کی رقم چار سو دینار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ادا کی اور انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ بھیج دیا تھا۔ یہ اُس خاتون کی عزت افزائی تھی، جس نے دین کی خاطر غیر ملک میں بھی خاوند سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور اب حبشہ میں وہ ایک طرح جلاوطنی کی زندگی گزار رہی تھی۔

حضرت میمونہؓ کو پہلے خاوند نے طلاق دے دی تھی اور دوسرے کا انتقال ہو گیا تھا، یہ نکاح بھی ایک بیوہ کی پرورش ہی تھی۔

حضرت ماریہ قبطیہؓ کو ۶ھ میں عزیزِ مصر (مقوقیس) نے، اُس خط کے جواب میں بطور ہدیہ بھیجا تھا، جو آپؐ نے اُسے اسلام قبول کرنے کو لکھا تھا۔ عزیزِ مصر نے جواباً تحریر کیا کہ "میں نے آپؐ کے قاصد کی عزت کی اور دو لڑکیاں بھیجتا ہوں، جن کی قبطیوں (مصری قوم) میں بہت عزت کی جاتی ہے اور میں آپؐ کے لیے کپڑا اور سواری کا ایک خچر بھیجتا ہوں"۔[1]

عزیزِ مصر نے دو لڑکیاں جو بھیجی تھیں، اُن میں ایک ماریہ قبطیہ تھیں، جو حرمِ نبویؐ میں داخل ہوئیں۔ دوسری سیرین تھیں، جو حضرت حسانؓ کی ملک میں آئیں۔ طبری نے لکھا ہے کہ "ماریہ اور سیرین حقیقی بہنیں تھیں۔ حضرت حاطبؓ ابن بلتعہ جن کو آنحضرتؐ نے مقوقیس کے پاس خط دے کر بھیجا تھا، اُن کی تعلیم سے دونوں خاتونیں خدمتِ نبوی میں پہنچنے سے پہلے اسلام قبول کر چکی تھیں۔ اس واقعہ کو اس حیثیت سے دیکھنا

---

[1] سیرت النبی، جلد اوّل ص ۴۸۴

چاہیئے کہ یہ خاتونیں لونڈیاں نہ تھیں اور اسلام قبول کر چکی تھیں، اس لیے آنحضرتؐ نے ماریہؓ سے نکاح کیا ہوگا۔"[1]

یہی وہ اُمّ المومنین ہیں، جن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے صاحبزادے حضرت ابراہیم ۸ھ میں پیدا ہوئے اور سترہ ماہ زندہ رہے[2] اور بعض نے لکھا ہے کہ صرف سوا دو مہینے زندہ رہے۔[3]

حضرت صفیہؓ ۷ھ میں خیبر کی فتح پر آپ کے نکاح میں آئیں، جن کا تذکرہ سیرت النبی میں ان الفاظ میں ہے۔ "حضرت صفیہؓ خاندان کے تباہ ہونے کے بعد خاندان سے باہر بیوی یا کنیز بن کر رہتیں، وہ رئیس خیبر کی بیٹی تھیں، اُن کا شوہر بھی قبیلہ نضیر کا رئیس تھا۔ باپ اور شوہر دونوں قتل کئے جا چکے تھے۔ اس حالت میں اُن کے پاس اُن کے پاسِ خاطر، حفظِ مراتب اور رفعِ غم کے لیے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ آنحضرتؐ اُن کو اپنے عقد میں لے لیں، وہ کنیز ہو کر بھی رہ سکتی تھیں، لیکن آنحضرتؐ نے اُن کی خاندانی عزت کے لحاظ سے اُن کو آزاد کر دیا اور پھر نکاح پڑھایا، بلکہ مسند ابن حنبل میں ہے کہ آپؐ نے اُن کو اختیار دیا کہ وہ آزاد ہو کر اپنے گھر چلی جائیں یا آپؐ کے نکاح میں آنا قبول کریں، اُنہوں نے دوسری صورت پسند کی،"[4]

یہ تھے مختصر حالات آپؐ کی بارہ ازواجِ مطہرات کے۔ ایک غیر جانب دار مؤرخ اب خود اندازہ لگا سکتا ہے کہ پہلی بیوی کی وفات کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس سے ساٹھ برس کی عمر تک جو گیارہ نکاح کئے، وہ کن وجوہ کی بنا پر تھے اور اُن کے اسباب و علل کیا تھے۔ آخر میں ایک مختصر سی بات یہ کہ عرب میں کسی

---

[1] سیرت النبی، جلد اوّل ص ۸۵-۴۸۴

[2] سیرت النبی، جلد اوّل ص ۸۵-۴۸۴

[3] تاریخ اسلام حصہ اوّل، شاہ معین الدین ندوی ص ۱۲۵

[4] سیرت النبی، جلد اوّل ص ۶-۵۰۵

سردارِ قبیلہ، کسی رئیس یا مالدار شخص کے لیے یہ ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ اُس کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں، اور یہ بات یا رسم آج چودہ سو برس گزر جانے پر بھی سارے سعودی عرب میں جاری و ساری ہے۔ عرب میں یہ بات کوئی عیب یا برائی خیال نہیں کی جاتی، بلکہ یہ ایک طرح کی علامت ہے امارت، ریاست یا سرداری کی۔ ہر ملک کے اپنے اپنے رسم و رواج ہیں، جنہیں دوسرے ممالک کے باشندوں کو اپنے نقطۂ نگاہ اور اپنے مذہبی عقائد پر پرکھ کر بُرا بھلا نہیں کہنا چاہیئے۔

اُمہات المومنین کے اِس مختصر تذکرے کے بعد، ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سب سے اہم واقعہ کی طرف لوٹتے ہیں، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے اور تاریخی طور پر ثابت ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگاروں کو اِس بات پر مُصر نہیں ہونا چاہیئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے واقعات من و عن وہی ہیں، جو بیان کئے جا رہے ہیں، سوائے اُن واقعات کے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے اقوال یا قرآن سے ثابت ہوں۔

ہمارے خیال سے سیرت نگاروں کا نقطۂ آغاز وہ ہونا چاہیئے، جب پیدائشی یتیمؐ، عبدالمطلب کے پوتےؐ، عبداللہ کے بیٹےؐ اور ابو طالب کے بھتیجےؐ چالیس برس کی عمر میں ڈرے اور سہمے ہوئے غارِ حرا سے نکلتے ہیں اور کانپتے جسم سے گھر لوٹتے ہیں اور اپنی شریکِ حیات حضرت خدیجہؓ سے فرماتے ہیں "مجھ پر کپڑا ڈال دو"۔ جب طبیعت میں ذرا سکون ہُوا، تو بیوی سے فرمایا کہ "میں ایسے واقعات دیکھتا ہوں کہ مجھے اپنی جان کا ڈر ہو گیا ہے"۔ [1]

یہ واقعہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ تو نبوت کی خواہش تھی اور نہ ہی اُس کے متلاشی تھے۔ غارِ حرا میں وہ کیا سوچتے اور کیا عبادت کرتے تھے، [2]

---

[1] رحمۃ للعالمین ص۴۷

[2] صحیح بخاری میں ہے "جب آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ کی عبادت کیا تھی، فرمایا "غور و فکر اور عبرت پذیری" (سیرت النبی حصہ اوّل)

یہ بات اللہ اور اُس کے رسولؐ ہی کے مابین ہے، البتہ ایک بات جو اس واقعہ سے عیاں ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اِس امین و صادق بندے کو منصبِ نبوت کے لیے چن رکھا تھا، اور مناسب وقت پر نبوّت کی امانت اُس کے سپرد کردی۔

نبوت ایسا عظیم عطیہّ خداوندی ہے کہ جس سے بڑا عطیہ، انسان کے لیے ہو ہی نہیں سکتا، انسان اِس پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے، لیکن یہاں تو ناز والی بات ہی نہیں، بلکہ اعصاب پر خوف و ہراس طاری ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ پہلا انسان جو آپؐ کی نبوت پر شہادت دیتا ہے، مکہ کا ایک عیسائی عالم ورقہ بن نوفل ہے، اور عیسائی ہی ہیں، جنہوں نے آپؐ اور آپؐ کی نبوت کے بارے میں سب سے دریدہ دہنی سے کام لیا ہے۔ ان دریدہ دہنوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ نبوت کے پہلے تین برسوں میں جہلاء و کفّار کی بستی میں جن لوگوں نے آپؐ کی نبوت پر صاد کیا اور اسلام لائے، وہ حضورؐ ہی کی طرح سلیم الطبع اور نیک سیرت لوگ تھے، جن میں سے اکثر اسلام کے عظیم فرزند بن کر اُبھرے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے اپنے اپنے دورِ خلافت میں جس عظمتِ کردار اور رفعتِ سیرت کا مظاہرہ کیا، سبھی اُس سے واقف ہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں، جو اوّلین ایمان لانے والوں میں سے ہیں، اور ان ہی پر مخالفین اسلام کا سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو تلوار کے زور سے پھیلایا، حالانکہ یہ لوگ نہ تو کسی لالچ کی بنا پر اسلام لائے تھے اور نہ تلوار کے خوف ہی سے، اور نہ ہی اُنہوں نے اپنے نبیؐ کو تلوار کے زور سے اسلام پھیلاتے دیکھا تھا۔ اُن کا نبیؐ تو تین برس چپکے چپکے بت پرستوں کو توحید کی طرف بلاتا رہا تھا۔ اِس پر بھی اُنہیں شدید غصہ تھا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔
ان تین برسوں میں صرف ۱۳۳ یا ۱۴۲ مرد، عورتیں اور لونڈی غلام آپؐ پر ایمان لائے تھے۔ حتیٰ کہ اُن ہی میں سے ایک، تلوار سے داعی اسلام کا خاتمہ کرنے نکلا تھا۔

کہ دارالارقم میں خود اپنی ہی شمشیرِ برہنہ سے اپنے کفر کو کاٹ کر اسلام کا بازو و شمشیر زن بن گیا تھا۔ یہ اُسی کا عہدِ سعید تھا، جس میں قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتوں کے گھپ اندھیاروں میں نورِ اسلام نے اُجالا کیا تھا۔ کیا بنی اسرائیل کی تاریخ بھی کسی ایسے دشمنِ موسیٰؑ کی نشان دہی کر سکتی ہے، جو شریعتِ موسوی کو صحرائے سینا سے نکال کر دُور نہیں تو اُس پاس ہی کے ممالک عرب، فلسطین و مصر میں پھیلا آیا ہو؟ کیا حضرت عیسیٰؑ کے دشمنوں میں بھی کوئی ایسا نظر آتا ہے، جس نے اُن کی نبوّت کا اقرار کرنے کے بعد، اُن کی ایسی پشت پناہی کی ہو، جیسی عمرِ فاروقؓ نے اپنے پیغمبر کی، کی۔ عمرؓ تو وہ تھے کہ جب دارالارقم سے لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ کر نکلے تھے، تو ہمیشہ کے لیے اسلام کے پشتیبان بن گئے تھے اور یہی وہ فاتح بیتُ المقدس ہے، جس پر عیسائی دنیا کو سب سے زیادہ غصہ ہے اور ان ہی عیسائیوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ فاتح بیتُ المقدس، جب عیسائیوں کو پناہ دینے کے لیے مدینہ سے بیتُ المقدس پہنچا تو اُس کی سواری پر اُس کا غلام سوار تھا کہ آقا و غلام کے لیے ایک ہی سواری تھی اور جب سواری بیتُ المقدس کے قریب پہنچی تھی تو غلام کے سوار ہونے اور آقا کے پیدل چلنے کی باری تھی۔

تاریخی لحاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا نقطۂ آغاز وہ واقعہ ہے، جب منصبِ رسالت پر فائز ہونے کے تین برس بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم خداوندی ملا کہ "اور تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے، واشگاف کہہ دے" (ترجمہ) اس فرمانِ باری تعالیٰ کے تحت صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر اہلِ مکہ کو بآوازِ بلند پکارتے ہیں، اور پھر ناظرین و سامعین سے یوں مخاطب ہوتے ہیں،

"اے قریشیو! اگر میں تم سے کہوں کہ پہاڑ کی پشت پر ایک لشکرِ جرّار آرہا ہے، تو تم کو یقین آئے گا"

سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا "ہم نے تم کو ہمیشہ سچ بولتے پایا ہے"

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے، تو تم پر سخت عذاب نازل ہوگا"۔ [1]

اِس پکار کے شاہد تو بہت سے تھے، جن میں آپؐ کا شدید مخالف چچا ابولہب بھی تھا۔ یہی وہ پکار تھی جس نے دوستوں کو دشمن، عزیزوں کو بیگانہ اور یہاں تک کہ چچا کو بھتیجے کے خون کا پیاسا بنا ڈالا تھا۔ یہی وہ پکار تھی، جس سے مکہ کا برسوں سے مانا ہُوا صادق، (نعوذُ باللہ) کاذب ٹھہر گیا تھا، حالانکہ سب سے سچی اور سچی بات اُس نے برملا آج ہی کہی تھی۔ آج ہی وہ دن تھا، جس میں کہی گئی بات پر اُسے مسلسل تیرہ برس شاعر و ساحر و مجنون کے نازیبا و ناروا و ناملائم ناموں سے پکارا گیا، اور ایسی ایسی تکلیفیں اور صعوبتیں سہنا پڑی تھیں، جو چند دن، چند ماہ یا زیادہ سے زیادہ چند برس تو شاید اوروں نے بھی برداشت کی ہوں مگر مسلسل تیرہ برس کی ایسی شدید اذیت دہی کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہی وہ شدید اذیت تھی جس کی ماقبل کے پیغمبر تاب نہ لا سکے تھے۔

احکام خداوندی سے

"اور تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے، واشگاف کہہ دے"۔ (حجر)

"اور اپنے نزدیک کے خاندان والوں کو خدا سے ڈرا" (شعراء ۱۱)

کے تحت جب قریش اور اہل مکہ کو پکار کر کہہ دیا گیا "اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذاب شدید نازل ہوگا" اور جب خاندان والوں کو دعوت کھلا کر یہ پوچھا گیا کہ "میں وہ چیز لے کر آیا ہوں، جو دین اور دنیا کو کفیل ہے۔ اِس بارگراں کے اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا۔" [2] تو سوائے اُس کے جو عمر میں سب سے چھوٹا اور جسم میں سب سے کمزور تھا، کسی نے بھی ساتھ دینے کا وعدہ نہ کیا، اور جس نے وعدہ کیا، اُس نے خوب نباہیا، اور ایسا نباہیا کہ ذوالفقار کا مالک بنا، بدر سے اُحد اور خندق سے خیبر تک دشمنانِ اسلام کے

---

[1] تاریخِ اسلام از شاہ معین الدین ندوی حصہ اوّل ص ۲۱

[2] سیرت النبی حصہ اوّل ص ۲۱۳

پرخچے اُڑا دیئے، لیکن فاتح خیبر اُس وقت سب سے کمزور و ناتواں تھا اور آشوبِ چشم کا مریض بھی اور یہی مرض فتحِ خیبر کے دن بھی اُسے لاحق تھا، لیکن آج تو فتح و نصرت، انعام و اکرام کا دن تھا، اور اِس اکرامیے کا حق دار اُس سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا تھا، جس نے ۴۳ ھ میلادی میں تیرہ برس کی عمر میں ناتوانی و آشوبِ چشم کے باوجود جبّارانِ قریش کی بھری محفل میں ہادیِ برحق کا ساتھ نباہنے کا وعدہ کیا تھا۔ آج ۷ ھ میں ستّرہ برس بعد وہی نوجوان ایک بار پھر آشوبِ چشم میں مبتلا تھا اور آج اُسی ہادیِ برحق نے اپنے لعابِ دہن سے اُس کے آشوبِ چشم کو شفا بخشتے ہوئے، عَلَمِ فتح اُسے بخش دیا تھا تاکہ آشوبِ روزگار قومِ یہود کے فتنہ و فساد سے سرزمینِ خیبر کو پاک کر دے اور جب اُس نے اپنی ذوالفقار سے یہودیوں کے مانے ہوئے بہادر مرحب کے ٹکڑے کر ڈالے تو قومِ یہود میں آشوبِ محشر بپا ہو گیا اور خیبر فتح ہو گیا۔

نزدیک کے خاندان والوں میں سے صرف ایک ہی ڈرا تھا کہ وہی اُن سب میں سعید تھا، باقی سب بدبخت ہنسی اور ٹھٹھا کرتے ہوئے اُٹھ گئے تھے کہ دیکھو ۴۴ تینتالیس برس کا پیغمبر اور تیرہ ۱۳ برس کا ایک کمزور و لاغر اور آشوبِ چشم کا مریض دنیا و دین کی کفالت کو نکلے ہیں۔

اس واقعہ کے دو برس بعد تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چالیس کے لگ بھگ ماننے والوں اور اُنہیں اتنا ستایا گیا کہ جس کی تفصیل سے کتبِ سیرت کے اوراق سیاہ لباس پہنے جبّارانِ قریش و کفارانِ مکہ پہ ماتم کناں ہیں۔ شدید اذیتوں و صعوبتوں اور سبّ و شتم کے باوجود، وہ نبی کہ رحمۃ للعالمین و خاتم النبیین کہلاتا ہے، جور و ستم اور ظلم و جفا کرنے والوں کی اِس بستی کو حضرت یونسؑ کی طرح چھوڑ کر نہیں گیا اور نہ حضرت موسیٰؑ کی طرح اپنے پیروکاروں کو لے کر ہجرت کر گیا، بلکہ اُس نے ستم رسیدہ، جفا چشیدہ اور جسم دریدہ اپنے پیروکاروں سے یہ کہا کہ وہ ملک حبشہ کو ہجرت کر جائیں تو اس پر ۴۵ ھ میلادی کو گیارہ مرد اور چار عورتوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ حبشہ روانہ ہو گیا، لیکن فرض جو اُس کے سپرد کیا گیا تھا، اُس کی بجا آوری کے لیے وہ خود مکہ ہی میں مقیم رہا۔

مکہ کے سنگدل وظالم ہجرت کر جانے والے ان پندرہ افراد کو ظلم کی اِس بستی میں پھر سے گھسیٹ لانا چاہتے تھے، سو حبشہ کے بادشاہ کے دربار میں تحفے تحائف لے پہنچے کہ مظلوموں کو باندھ کر اپنے سرداروں کے قدموں میں لا ڈالیں اور یہ ثابت کر دیں کہ ہم ایسے جابر اور دست دراز ہیں کہ کوئی بھی ہمارے دستِ ستم سے بچ کر نکل نہیں سکتا۔

حضرت عیسیٰؑ کے پیروکار نجاشی کو بہکانے کے لیے کفارِ مکہ نے کہا کہ اِن کا عقیدہ (جو خود کو مسلم کہتے ہیں) حضرت عیسیٰؑ کے متعلق درست نہیں، تو نجاشی نے مسلمانوں کو دربار میں بلا بھیجا۔ جنابِ جعفرؓ نے حضرت عیسیٰؑ کی جب وہ حقیقت بیان کی جو سورۂ مریم میں ہے تو وہ پکار اُٹھا "محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو وہی رسولؐ ہیں۔ جن کی خبر یسوع مسیح نے دی تھی، اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اِس رسول کا زمانہ ملا"۔[1] اور کفارِ مکہ کو دربار سے نکلوا دیا۔

اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف زہر اگلنے والے ماضی قریب اور دورِ حاضر کے عیسائیوں کو اتنا بھی خیال نہیں آتا کہ اسلام کی صداقت پر پہلی شہادت ایک عیسائی عالم ورقہ بن نوفل کی تھی اور اسلام کے پیروکاروں کی مہاجرت میں پہلی پشت پناہی بھی ایک عیسائی شاہِ حبشہ نجاشی ہی نے کی تھی، جس نے پیغمبرِ اسلام کو برحق مانا تھا، جس کی بشارت حضرت عیسیٰؑ نے دی تھی۔

اے عیسائیو! کچھ بتاؤ تو سہی! تمہاری وہ انجیل کیا ہوئی، جو ورقہ بن نوفل اور شاہِ حبشہ نجاشی کی تحویل میں تھی، جس کی روشنی میں انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کی شہادت دی تھی، اس کے وہ اوراق کہاں گم ہو گئے، جن میں فارقلیط کے آنے کی خبر دی گئی تھی، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جس پر قرآنؐ "اسمہٗ احمدؐ" کہہ کر شہادت دیتا ہے اور جس کا ذکر برنباس کی انجیل میں تھا اور جو ماضی قریب میں دستیاب بھی تھی؟

قریشِ مکہ کی سفارت، حبشہ سے پندرہ مسلمانوں کو قیدی بنا کر مکہ واپس لانے

---

[1] رحمۃ للعالمین جلد اوّل صہ ۵۹

میں جب ناکام رہی تو اُنہوں نے اِس ناکامی کا بدلہ یوں چکایا کہ واپس مکہ پہنچ کر مسلمانوں، خصوصاً نادار مسلمانوں پر ظلم وستم کی انتہا کر دی۔ کوئی پیٹا گیا، کوئی سرِبازار گھسیٹا گیا، کسی کو تپتی دوپہر میں مکہ کی جلتی بھنتی پتھریلی زمین پر پتھروں کے بوجھ تلے دبایا گیا، اور کسی کے سینے پر کھڑے ہو کر دہکتے انگاروں پر یوں لٹا دیا گیا، جیسے وہ جیتا جاگتا انسان نہیں، کباب ہے، جیسے بھون دینا چاہیئے۔ ظالموں نے اس پر بس نہیں کیا، بلکہ نادار غلاموں کے ساتھ ساتھ اسلام لانے والی کنیزوں میں کوئی ابوجہل کی شقاوت سے اندھی ہوئی، تو کوئی اُس کی برچھی سے شہید۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ آقا پر ایمان لانے والوں اور کنیزوں پر ہی ظلم وستم کے پہاڑ ٹوٹے کہ وہ نہتے تھے، مفلس ونادار تھے۔ نہیں نہیں بلکہ اُن کے آقا کی راہ میں بھی کانٹے بچھائے گئے، گلے میں کپڑا ڈال کر گھمایا گیا، جسم پر خاک ڈالی گئی اور جب اِس پر بھی وحشت وجہالت کو تسکین نہ ہوئی تو خانہ خدا کے سامنے سجدہ ریز اللہ کے اِس بندے کی پشت پر اونٹ کی اوجھ لاکر ڈال دی گئی، لیکن کمال ہے اُس انسانِ کامل کی ہمتِ عالی اور ظرفِ مثالی کا کہ نہ اُن سے جھگڑا کیا اور نہ اُس خدا سے کچھ شکایت ہی کی، جس نے ظالموں دسفاکوں کے پنجۂ استبداد میں اُسے بے بس کر رکھا تھا۔

آج چودہ سو برس بعد سیرت کی کتابوں میں اُس ظلم وستم کی تفصیل جب پڑھتے ہیں جو اوّلین مسلمانوں پر ڈھائے گئے تو ہمارے مغرب زدوں کو وہ افسانہ وافسوں نظر آتے ہیں اور ایمان والوں کو جوئے خون، نہ وہ یقین کرتے ہیں کہ حقیقت تھی جو تاریخ نے نہایت ایمان داری سے محفوظ کر رکھی ہے اور نہ ایمان والوں میں اتنی حرارت ہی باقی ہے کہ اُن کے دل پگھل کر اُس جوئے خون کا حصہ بن جائیں۔ ہم ضعیف ایمان والوں کو اُن مضبوط ایمان والوں سے کیا نسبت ہو سکتی ہے، جو اللہ کی راہ میں توڑے اور مروڑے گئے، گھسیٹے اور جلائے گئے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ مسلماناں در گور و مسلمانی در کتاب، تو ہمارے ہی اعمال و افعال کو دیکھ کر کہا ہوگا۔

ہاں تو جناب! بات تھی آج سے چودہ سو برس پہلے ۵ھ بعد بعثت کی، جب پہلی ہجرتِ حبشہ کے پندرہ افراد کو قریشِ مکہ قیدی بنا کر لانے میں ناکام رہے تو اپنی

نامرادی کا بدلہ اُنھوں نے بڑی شدّ و مد سے مکہ کے بقیہ خدا پرستوں سے لینا شروع کیا، تو اُن میں سے کچھ، جو یہ خبر سن کر حبشہ سے لوٹ آئے تھے کہ اہلِ مکہ ایمان لے آئے اور کچھ دوسرے ستم رسیدہ و ظلم چشیدہ ایک سو دو مومن (جن میں بیاسی مرد اور بیس عورتیں تھیں) ترکِ وطن کر کے حبشہ چلے گئے، [1] جو تاریخ کے اوراق میں دوسری ہجرت حبشہ کہلاتی ہے۔

قریش کی جفا کیشیوں اور ستم رانیوں کے باوجود ایک اللہ کے ماننے والے، جب اپنے دینِ حق سے منحرف نہ ہوئے، بلکہ کچھ اور بھی اُس میں داخل ہو گئے، تو اُنھوں نے بنی ہاشم کے مقاطعے کی ٹھانی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان والوں سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر لیے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب خاندان والوں کو لیے ایک گھاٹی میں منتقل ہو گئے۔ تین برس کی یہ نظر بندی، گویا کربلائے اُولےٰ تھی، جس میں بنی ہاشم اور دیگر ایمان والے بھوک و پیاس سے تڑپے، بلبلائے، درختوں اور جھاڑیوں کے پتے کھائے اور سوکھے ہوئے چمڑے بھی۔ یزید کے لشکر نے جس طرح کربلا میں اہلِ بیت کو پانی سے ترسایا، اُسی طرح قریش نے اہلِ شعبِ ابی طالب کو پانی سے تڑپایا۔ بچوں کی پیاس پر جس طرح لشکرِ یزید خنداں کناں تھا، اُسی طرح قریش اہلِ شعبِ ابی طالب کے گرسنہ و تشنہ بچوں کو بلکتے سن کر قہقہے لگاتے تھے۔

اے دریدہ دہن عیسائیو! اپنے زہر چکاں قلم اٹھانے سے پہلے مسلمانوں کی اِس کربلائے اُولےٰ کی گرسنگی و تشنگی تو ملاحظہ کرو! جو مکہ کی تاریخ کے تین برسوں پر محیط ہے، جس کے شاہد دوست ہی نہیں، دشمن بھی ہیں، اور ذرا یہ تو بتاؤ کہ کیا حضرت عیسیٰؑ کے پیروکاروں پر بھی یہ حالت گزری؟ اے من و سلویٰ سے نوازے جانے والے یہودیو! ذرا یہ تو بتاؤ کہ شعبِ ابی طالب میں اُمّتِ محمدی کو ایک دن بھی وہ کچھ دیا گیا، جس سے برسہا برس تمہاری خاطر و تواضع کی گئی تھی۔ کفرانِ نعمت سے اگر تم پھٹکارے گئے تو حق

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اول صـ ۲۷

تھا، اور شعبِ ابی طالب والے اگر نوازے گئے تو ناحق نہ تھا، اور اسی نوازش پر تم آج تک یسح پا چلے آتے ہو، اور اُس انسانِ کامل کی ذاتِ گرامی میں کیڑے نکالتے ہو، جس نے اپنے رب سے شعبِ ابی طالب والوں کے لیے نہ ابر کا سایہ مانگا اور نہ من وسلویٰ کی بارش، وہ مانگتا بھی کیونکر کہ وہ تو خود سایۂ رحمت اور ابرِ کرم بن کر زمین پر آیا تھا۔

یہ اُسی سایۂ رحمت کا ذکر ہے، جو شعبِ ابی طالب میں تین برس بے سایہ رہا، اور یہ اُسی ابرِ کرم کا تذکرہ ہے، جس نے تین برس مکہ کی بے ابرو سنگلاخ گھاٹی میں صرف اپنے رب کے کرم سے کمال صبر و استقامت سے گزار دیئے اور جب اُس کے کرم نے کفّار کے دلوں میں ذرا سی نرمی پیدا کر دی، تو وہاں سے نکل آیا۔

شعبِ ابی طالب کے فقر وفاقہ، حزن و ملال کے روز و شب ہی کافی نہ تھے کہ عشق کے امتحاں ابھی اور بھی تھے کہ شعبِ ابی طالب سے نکلتے ہی ابی طالب موت کی اُس گھاٹی میں اتر گئے، جہاں سے بھتیجے کا ساتھ دینا اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ ابی طالب کا کفن بھی ابھی میلا نہ ہُوا تھا کہ رفیقۂ حیات کا انتقال ہو گیا، جنہوں نے اپنی ساری مہر و محبت آپؐ کے لیے وقف کر دی اور سارا مال و منال آپؐ کو منتقل کر دیا، جو آپؐ فراخ دلی سے یتامیٰ و مساکین کو منتقل کرتے آئے تھے۔ یہ دو انتقال ایسے تھے، جس نے بظاہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کفارِ مکہ کے پنجۂ استبداد میں دے ڈالا تھا، کیونکہ حضرت خدیجہؓ کی امارات اور ابی طالب کی خاندانی وجاہت کفارِ مکہ کی راہ میں گو کہ سدِ سکندری تو کبھی نہ بنی مگر حدِ پاس و لحاظ ضرور تھی، اور پاس و لحاظ جب درمیان سے اُٹھ گئے تو کفارِ مکہ شیر ہو گئے۔

اہلِ مکہ کی مسلسل ایذا رسانیوں خصوصاً ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد اُن کی چیرہ دستیوں سے آپؐ تنگ آ گئے تو اہلِ طائف کی طرف رخ کیا کہ شاید دعوتِ اسلام پر لبیک کہیں۔ اُس زمانے میں طائف کی سرداری عمرو بن عمیر کے تین بدبخت لڑکوں کے ہاتھ تھی، جن سے آپؐ نے رجوع کیا۔ آپؐ پر ایمان لانے کی بجائے، جو گستاخانہ اندازِ گفتگو انہوں نے اختیار کیا، اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اِس بات کا

غصہ تھا کہ اللہ نے ایک نادار و مفلس کو پیغمبری کے لیے کیوں منتخب کیا ہے، جس کے پاس سواری کے لیے گدھا تک نہیں، جو مکہ سے طائف تک کا قریباً پچاس میل کا پہاڑی راستہ پاپیادہ طے کر کے آیا ہے اور وہ جو سردارِ طائف ہیں، اُن کو نظر انداز کر دیا ہے، گویا اُنہیں اللہ کے نبی پر ہی نہیں۔ اللہ پر بھی غصہ تھا، اور اِس غصے کا اظہار ایک نے اپنے جابر و قاہر ہونے کی بنا پر یوں کیا ”میں کعبے کے پردے نوچ ڈالوں گا، اگر اللہ نے تم کو رسول بنایا ہے“۔ دوسرے نے اللہ پر اپنی ناراضی کا اظہار یوں کیا کہ ”کیا خدا کو تمہارے سوا کوئی رسول بنانے کے لیے نہیں ملا؟“ اور تیسرے نے اپنے کبر و نخوت کا ثبوت یہ کہہ کر دیا ”میں تم سے ہرگز بات نہیں کروں گا، کیونکہ اگر تم واقعی اللہ کے رسول ہو تو اس سے بزرگ تر ہو کہ میں تمہاری بات کا جواب دوں، اور اگر تم اللہ کا نام لے کر جھوٹ بول رہے ہو تو اِس قابل نہیں ہو کہ تم سے بات کی جائے“۔ [1]

کبر و نخوت کے ان پتلوں سے مزید بات کرنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہی تھی، اس لیے آپؐ اُن کے پاس سے اُٹھ گئے مگر اُن کی انا کی تسکین ابھی نہ ہوئی تھی۔ اللہ تو اُن کی دسترس سے باہر تھا، جس نے انہیں نبی نہ بنا کر (نعوذ باللہ) غلطی کی تھی، لیکن وہ اِس غلطی کو اس طرح معاف کرنے والے نہ تھے، لہٰذا انہوں نے اللہ کی اِس غلطی کا خمیازہ اُس کے رسولؐ سے چکا لینا مناسب سمجھا اور اپنے غلاموں، نوکروں چاکروں اور شہر بھر کے لچے لفنگوں کو آپؐ کے خلاف اُبھار دیا، اور اُنہوں نے آپؐ پر ایسا ستم ڈھایا، جسے عمر بھر آپؐ نہ بھولے اور معرکۂ اُحد ۳ھ کے بعد جب حضرت عائشہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا ”کیا آپؐ پر اُحد کے معرکے سے بھی زیادہ سخت وقت آیا ہے“؟ آپؐ نے جواب میں طائف کے واقعہ کا ذکر کیا اور فرمایا کہ ”میں غم زدہ حالت میں جدھر منہ اُٹھا، اُدھر چل پڑا“۔ [2]

---

[1] سیرت سرورِ عالم از مولانا مودودی جلد دوم ص ۶۳۳

[2] سیرت سرورِ عالم جلد دوم ص ۶۳۵

اِس غم زدہ حالت کو پہنچانے والے الطائف کے اوباش تھے " جو ہر طرف سے آپؐ پر ٹوٹ پڑے تھے، یہ مجمع دو رویہ صف باندھ کر کھڑا تھا۔ جب آپؐ اُدھر سے گزرے تو آپؐ کے پاؤں پر پتھر مارنے شروع کئے، یہاں تک کہ آپؐ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں۔ جب آپؐ زخموں سے چُور ہو کر بیٹھ جاتے تو بازو تھام کر کھڑا کر دیتے۔ جب آپؐ پھر چلنے لگتے تو پتھر برساتے، ساتھ ساتھ گالیاں دیتے اور تالیاں بجاتے جاتے۔ آخر آپؐ نے ایک باغ میں انگور کی ٹیٹوں میں پناہ لی، یہ باغ عتبہ بن ربیعہ کا تھا، جو باوجود کفر کے شریف الطبع اور نیک نفس تھا "۔[1]

اللہ کے نبیؐ پر آج کا دن بہت ہی بھاری گزرا تھا، اور اس پر ان کا دل بھر آیا، اور اپنی بے بسی سے متعلق اپنے اللہ سے یوں فریاد کی تھی،

" الٰہی! اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں کی تحقیر کی بابت تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں۔ تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ درماندہ عاجزوں کا مالک تو ہی ہے اور میرا مالک بھی تو ہی ہے۔ مجھے کس کے سپرد کیا جاتا ہے، کیا بیگانہ ترش رُو کے یا اُس دشمن کے جو کام پر قابو رکھتا ہے، لیکن مجھ پر تیرا غضب نہیں، تو مجھے اِس کی کچھ پروا نہیں، کیونکہ تیری عافیت میرے لیے زیادہ وسیع ہے۔ میں تیری ذات کے نور سے پناہ چاہتا ہوں، جس سے سب تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دنیا دین کے کام اِس لیے ٹھیک ہو جاتے ہیں کہ تیرا غضب مجھ پر اُترے، یا تیری ناراضامندی مجھ پر وارد ہو۔ مجھے تیری ہی رضامندی اور خوشنودی درکار ہے اور نیکی کرنے یا بدی سے بچنے کی طاقت مجھے تیری ہی طرف سے ملتی ہے "۔[2]

۲۷ رجب سنہ ۱۰ نبوی[3]   ۲۷ رجب سنہ ۱۲ نبوی[4]

---

[1] سیرت النبی حصہ اوّل ص ۲۵۵-۲۵۴

[2] رحمۃ للعالمین حصہ اوّل ص ۶۸-۶۷

[3] رحمۃ للعالمین ص ۷

[4] اسوہ حسنہ ص ۲

تاریخ بنیِ آدم میں وہ مبارک دن اور سال ہے، جس میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ "جس سے ہبوطِ آدم کا داغ دھل گیا۔ انسان جو سماوی بلندیوں سے ارضی پستیوں پر گرایا گیا تھا، اُسی انسان کو پھر سے اُسی بلکہ اُس سے بھی اعلیٰ وارفع (قابَ قوسین و ادنیٰ) کی بلندیوں سے سرفراز کیا گیا۔ اِس عروجِ آدمِ خاکی سے یہ راز بھی کھلتا ہے کہ انسان کی خواری و ذلت کا داغ دھل گیا۔ اُس نے حکمِ خداوندی کو بھول کر اگر شجرِ ممنوعہ کو ہاتھ لگایا تھا تو آج اُسی نے اطاعتِ خداوندی کی اُس حد کو چھولیا، جو کسی بھی مخلوقِ خداوندی سے ممکن نہ تھی۔ تنزل کی جس داستان کا آغاز سما سے ارض کے سفر سے ہوا تھا، اُس کا اختتام ارض سے سما کی طرف سفرِ معراج سے ہوا۔" [1]

معراج، تاریخِ اسلام اور سیرتِ نبویؐ کا ایسا واقعہ ہے، جسے کسی سیرت نگار نے جسمانی اور کسی نے روحانی قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے مستند شہادت قرآنِ کریم کی ہے "پاک ہے وہ، جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجدِ حرام سے دُور کی اُس مسجد تک، جس کے ماحول کو اُس نے برکت دی، تاکہ اُسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے، حقیقت میں وہی ہے، سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا۔"
(بنی اسرائیل۔۱)

معراجِ جسمانی و روحانی سے متعلق اختلاف وصالِ نبوی کے بعد کا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن القیم لکھتے ہیں کہ "حضرت عائشہؓ و معاویہ و امام حسن بصریؒ سے مروی ہے کہ اسریٰ روحِ مبارک کو ہوا تھا اور جسمِ مبارک اپنی جگہ سے مفقود نہیں ہوا تھا۔" [2]
حضرت عائشہؓ اور امام حسن بصریؒ کی روایت کے باوجود اکثریت اِس بات کی

---

[1] اُردو سفرنامے تحقیقی و تنقیدی جائزہ۔ مقالہ پی ایچ، ڈی ص۱ راقم الحروف۔
[2] رحمۃٌ للعالمین حصہ اوّل ص۷

قائل ہے کہ معراج جسمانی تھی، جس پر غیر مسلموں اور بعض مسلموں نے حرف گیری کی، جس سے گھبرا کر مسلمان سیرت نگاروں میں سے بعض نے معراج کو جسمانی کی بجائے روحانی قرار دے دیا۔

آج جس دور میں ہم آپ سانس لے رہے ہیں اور انسان چاند پر پہنچ چکا ہے اور اِن حقائق کا انکشاف ہو چکا ہے کہ صرف اپنے قریبی ہمسائے تک پہنچنے کے لیے کس قدر ساز و سامان اور وقت درکار ہے، تو پھر ہمارے لیے عقلاً کیا وزن اور دلیل رہ جاتی ہے، جس سے ہم یہ ثابت کر سکیں کہ جس واقعہ پر ہمارا ایمان ہے، واقعی وہ جسمانی حالت میں ظہور پذیر ہوا تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ابھی ہم اُس زمانے تک نہیں پہنچے کہ ثابت کر سکیں کہ ایک انسان، جس نے خود اپنے انسان ہونے کا دعویٰ کیا، اور جس کے انسان ہی ہونے پر قرآن نے بھی شہادت دی ہے، بغیر کسی ساز و سامان یعنی سائنسی آلات کے چاند سے بھی وراء بلکہ وراء الوراء سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ سکتا ہے۔ اب سوال اُس بُراق کا رہ جاتا ہے، جو مکہ المکرمہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے سوئے آفاق لے اُڑا تھا۔ سواری کا یہی وہ بُراق ہے، جو یہ ثابت کرتا ہے کہ معراج جسمانی تھی۔ معراج اگر روحانی ہوتی تو پھر بُراق کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دوسری بات بُراق کی ماہیت کی ہے، جس سے متعلق روایت سے ہمیں اس قدر معلوم ہے کہ "اُس کا ہر قدم حدِ نظر پر پڑتا تھا۔" ایسی برق رفتار سواری ہماری مادی دنیا سے متعلق ہو نہیں سکتی، یقیناً وہ کسی اور مادے سے تخلیق کی گئی ہو گی۔ انسان اس دور میں اس بات کے سراغ میں ہے کہ یہ اُڑن طشتریاں کیا بلا ہیں، جو آج کے تیز ترین طیاروں کی زد سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ کیا ایسا تو نہیں کہ آج سے چودہ سو برس پہلے بھی ایسی ہی اُڑن طشتریوں کا وجود ہو اور کسی ایسی ہی ایجاد (جو ظاہر ہے، انسان کی ایجاد نہ تھی) کو بُراق کی شکل دے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کے لیے منتخب کیا گیا ہو۔

ہم بحیثیت مسلمان تو ویسا ہی ایمان رکھتے ہیں، جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رض کا تھا کہ "جب معراج کے واقعہ کی خبر آناً فاناً مکہ میں پھیل گئی۔ بعض مسلمان اُس کو سن کر اسلام سے پھر گئے۔ لوگ اِس اُمید پر حضرت ابوبکر رض کے پاس پہنچے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ راست ہیں، یہ پھر جائیں تو اِس تحریک کی جان ہی نکل جائے، مگر اُنہوں نے یہ قصہ سن کر کہا اگر واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ بیان کیا ہے، تو ضرور سچ ہوگا —— پھر حضرت ابوبکر رض حرمِ کعبہ میں آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے اور ہنسی اُڑانے والا مجمع بھی۔ پوچھا کیا واقعی آپؐ نے ایسا فرمایا ہے؟ جواب دیا ہاں۔ کہا بیتُ المقدس میرا دیکھا ہوا ہے۔ آپؐ وہاں کا نقشہ بیان کریں۔ آپؐ نے فوراً بیان کرنا شروع کر دیا، اور ایک ایک چیز اِس طرح بیان کی گویا بیتُ المقدس سامنے موجود ہو اور دیکھ دیکھ کر اِس کی کیفیت بتا رہے ہیں۔ حضرت ابوبکر رض کی اِس تدبیر سے جھٹلانے والوں کو ایک شدید ضرب لگی۔ [1]

مولانا مودودی مرحوم نے اپنی تالیف سرورِ عالم جلد دوم میں اِسراء و معراج کے واقعہ کی پوری تفصیل باب ۔۱۱ میں درج کی ہے، جس میں اُنہوں نے اِسے جسمانی معراج ہی قرار دیا ہے۔ بہر طور یہ وہ عظیم انعام تھا، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بعثت کے بعد مکی زندگی کے دس بارہ برس شدید تکلیفیں اور صعوبتیں اٹھانے پر ملا، اور آپؐ نے اپنی آنکھوں سے مکہ سے بیتُ المقدس تک کے ارضی حصے اور بیتُ المقدس سے ساتوں آسمانوں کی اور اُن سے اوپر سدرۃُ المنتہیٰ تک کی سیر کی اور اپنے رب کی نشانیوں (آیات) کو بچشمِ خود ملاحظہ فرمایا۔ زمین کے اِس ٹکڑے، ساتوں آسمانوں اور اُن سے ماوراء، سدرۃُ المنتہیٰ تک جو کچھ پیش آیا، سیرت کی اکثر کتابوں اور کچھ کتب احادیث میں موجود ہے۔ مسلمانوں میں سے جو اِسراء اور معراج کے اِس واقعہ کو نہیں مانتے یا مانتے ہیں تو اُسے روحانی اِسراء اور معراج کہتے ہیں، تو یہ اُن کا اپنا عقیدہ ہے۔ غیر مسلم اگر اِس واقعہ

---

[1] سیرتِ سرورِ عالم جلد دوم ص ۶۵۹

کو ماننے ہی انکار کرتے ہیں، تو یہ اُن کا اپنا فعل ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کس کس فعل اور کس کس قول سے انکار نہیں کیا اور جس جس فعل و قول کا اقرار کیا، اُس کی کیسی کیسی تاویلیں نہیں گھڑیں۔

اِسراء اور معراج کی عقلی دلیل تو تب ہی ہو سکتی ہے، جب بُراق کی ماہیّت ہمیں معلوم ہو، لیکن قلبی دلیل یہ ہے کہ قلب نے جب یہ یقین کر لیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اور رسول جو بھی ہیں، وہ سچے اور امین ہیں، چاہے وہ حضرت عیسیٰؑ ہوں یا حضرت موسیٰؑ، تو پھر رسول جو بھی کہیں، وہ حق اور سچ ہے، بشرطیکہ اُن کا کہا ہوا حق و سچ، مِن وعَن ہم تک پہنچا ہو۔ اس واقعے پر رسول عربیؐ کے کہے ہوئے پر اوّل تو قرآن ہی گواہ ہے، جس کا لفظ لفظ اور حرف حرف صحیح و سالم حالت میں ہمارے پاس موجود ہے، اور دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمایا ہوا، جس کی چھان بین اس قدر ہو چکی ہے کہ اب مزید چھان پھٹک کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔

ہمیں تو صرف ایک مختصر سی بات کہنا ہے اور وہ یہ کہ "اسراء بلکہ معراج ہی کا واقعہ ہے، جو انسان کو مسجودِ ملائکہ ثابت کرتا ہے کہ ایک انسان، سما کی اُن بلندیوں تک جا پہنچا، جو فرشتوں کی پہنچ سے بھی باہر ہیں، اور اُس نے ہبوطِ آدم کا وہ داغ دھو ڈالا، جو سماوی بلندیوں سے ارضی پستیوں پر گر کر اُس کی پیشانی پر لگا تھا، اور جس انسان نے وہ داغ دھویا، وہ واقعی انسانِ کامل و نبی اکملؐ ہے، جس کا نامِ نامی اور اسم گرامی محمدؐ اور احمدؐ ہے اور اُمّتِ محمدیہ جس کی نام لیوا ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ اَن گنت پیغمبروں، خصوصاً اُن معروف پیغمبروں سے (جن کا تذکرہ قرآن میں ہے) اللہ نے جب بھی کلام کیا، تو جبریل امینؑ کے ذریعے سے یا پسِ پردۂ نور، لیکن نبی اکملؐ کو ایک موقعہ ایسا بھی عطا کیا کہ سدرۃ المنتہیٰ کی بلندیوں پر بلا لیا۔ بات جو وہاں ہوئی، وہ وحی کے ذریعے بھی ہو سکتی تھی اور پسِ پردۂ نور بھی، جیسا کہ حضرت موسیٰؑ سے کوہِ طور پر ہوئی، لیکن مقصود تو یہ بتانا تھا کہ اے فرشتو! اے چھ سو

بازوؤں والے فرشتے جبریل[1] ! انسان کو آج وہ بلندی نصیب ہوئی ہے، جو نہ کسی اُولوالعزم نبی کو نصیب ہوئی اور نہ کسی مُقرّب فرشتے کو اور نہ ہو گی۔

یہی وہ واقعہ جس سے مُترشّح ہوتا ہے کہ بقول ملائکہ "انسان فتنہ وفساد پھیلا اور خون بہا سکتا ہے" جیسا کہ ہابیل وقابیل کے زمانے سے بہاتا چلا آیا ہے، تو اِس حد تک بلند بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی بلندی بھی باقی نہ رہے، جس سے یہ ثابت ہو کہ یہی وہ بات تھی، جسے تخلیقِ آدم کے وقت فرشتے سمجھنے سے قاصر تھے اور خالق کا یہ علم کامل تھا، جو اُن کے علم ناقص سے باہر تھا۔ معراج مصطفےٰ اگر وجود میں نہ آتی تو عظمتِ آدم کا راز کیسے کھلتا، اور انسان کیونکر یہ ثابت کر سکتا کہ مسجودِ ملائک بنائے جانے کا وہ حق دار تھا۔

تخلیقِ آدم کے وقت تو بات حکم کی بجا آوری کی تھی کہ فرشتے انسان کے گھٹیا پن اور اُس کی فتنہ وفساد اور خون بہانے والی کمینی خصلت کو جانتے ہوئے بھی اُس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے تھے اور شیطان نے اِسی بنا پر ہی سجدے سے انکار کر دیا تھا کہ مٹی سے بنایا گیا آدم خاکی گھٹیا اور میں اعلیٰ ہوں کہ آگ سے بنایا گیا ہوں۔ وہ مردود ٹھہرا، کیونکہ اُسے وہ علم نہ تھا، جو اُس کے رب کے علم میں تھا کہ خاک کا یہی پُتلا اپنی جسمانی وروحانی منزلوں کے ارتقاء سے گزرتا ہُوا، ایک دن ایسا انسانِ کامل بن جائے گا کہ سدرۃ المنتہیٰ کی بلندیوں کے لائق ٹھہرے گا اور فرشتوں کا سردار خود اپنی زبان سے اقرار کرے گا کہ۔

"اب آگے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اور آپ
کے رب کا معاملہ ہے، میرا مقام یہ ہے، جس سے آگے بس نہیں جا

---

[1] حدیثِ مبارک ہے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جبریلؑ کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا، اُن کے چھ سو بازو تھے۔ (سیرت سرورِ عالم جلد دوم صـ۶۷۶

سکتا"۔ [1]

معراج اِس بات کی بھی دلیل بھی ہے کہ یہ بارگاہِ ربُ العزت سے انسان کی عظمت پر تصدیقی مہر تھی اور عظمت کی اُس مہر سے جو مُشرّف ہُوا، وہ انسانِ کامل اور نبی اکمل ہے، جسے ہم نبی آخر الزمان کہتے ہیں۔ عظمت کا عطا کرنے والا بھی اللہ، نبوت پر سرفراز فرمانے والا بھی اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیدا کرنے والا بھی اللہ، لیکن اللہ کے بندے نے جس دل جمعی و ثابت قدمی، صبر و قناعت، عزم و حوصلے سے یہ نعمتِ عظمیٰ حاصل کی، اُس کی مثال تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔

بعثت سے ۷ئہ بعد بعثت تک یعنی شعب ابی طالب میں محصور ہونے سے قبل، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو گزری، کسی بھی انسان کا حوصلہ و ظرف نہیں کہ وہ اُسے برداشت کر جائے۔ طعن و تشنیع، سبّ و شتم سے زدوکوب تک اور اُس کے بعد شعبِ ابی طالب میں محصوری کی حالت میں فقر و فاقہ، اہلِ خاندان و پیرو کاروں کی گرسنگی و تشنگی اور بچوں کی آہ و زاری، ایک دن"، ایک ہفتہ نہیں، ایک مہینہ ایک برس نہیں، مکمل تین برس۔ اِس حالت سے متعلق سیرت نگاروں نے جو کچھ رقم کیا ہے، وہ اُس کا عشرِ عشیر بھی نہیں، جو اللہ کے اُس بندے [2] کے جسم و جان پر گزری، جو بنی آدم کو انسان بنانے اور عظمتِ آدم کا درس دینے کو اُٹھا تھا اور طوفانِ وحشت و بربریت، سیلابِ کفر و جہالت، طغیانِ ظلم و ضلالت میں گھر گیا تھا اور ظالموں نے ہر طرف سے گھیر کر اُسے مکہ کی ایک گھاٹی میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا تھا کہ اُسے، اُس کے خاندان اور اُس کے ماننے والوں کو بھوک پیاس سے تڑپا تڑپا کر مار ڈالا جائے، لیکن ہُوا یہ کہ وہ سونا کندن تھا، اور فقر و فاقہ، ظلم و ستم

---

[1] حدیث مبارک ہے "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبریلؑ جب اپنے مقام پر پہنچے تو اُنھوں نے کہا کہ اب آگے آپؐ کا اور آپؐ کے رب کا معاملہ ہے، میرا مقام یہ ہے، جس سے آگے میں نہیں جا سکتا"۔

(سیرتِ سرورِ عالم جلد دوم حاشیہ ص ۶۵۷)

کی کٹھالی سے پارس بن کر نکلا، ایسا پارس جس نے نہ صرف اپنے پارس ہونے پر (سدرۃ المنتہیٰ سے وراء) تصدیقی مہر لگوائی بلکہ بنی آدم میں سے جو بھی اُس کے ساتھ لگا کندن ہو گیا۔ اُس نے نہ صرف انسان کو مقامِ آدمیت سے آگاہ کیا بلکہ اُسے اِس راز سے بھی آشنا کیا کہ ارض و سما میں جو کچھ بھی ہے، اُسی کی خاطر وجود میں لایا گیا ہے۔ سب اُسی کے لیے اور اُسی کا ہے۔ اُسے ضرورت ہے تو صرف اتنی کہ اپنے آپ کو جانے پہچانے، اپنے اندر کی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور کائنات کی ہر شے کو اپنے قبضۂ قدرت میں کر لے۔ یہ اُسی انسانِ کامل اور نبی اکمل ؐ کا بتایا ہُوا نسخۂ کیمیا ہے، جس پر چل کر بنی نوعِ انسان آج تسخیرِ قمر تک پہنچی اور تسخیرِ زُہرہ کی طرف بڑھ رہی ہے۔

علم کی جو روشنی تورات و انجیل سے پھیلی، وہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک کفر و ضلالت، شرک و صنم پرستی کے اندھیاروں میں ڈوب چکی تھی۔ درحقیقت علم کا نُور چاروں جانب پھیلا تو قرآن سے، اور قرآن کا یہی علم تھا، جس نے اندلس کو منوّر کیا اور پھر یہ نُورِ علم یورپ کے اندھیاروں کو اُجالنے کے لیے اندلس کی سرحدیں پار کر گیا۔ یورپ صدیوں کی ردّ و کد اور حیص بیص کے بعد، اب اِس حقیقت کو تسلیم کرنے لگا ہے کہ اُسے روشنی بخشنے والے چراغ اسلام ہی کے تھے، لیکن یہ اس وقت تسلیم کیا ہے، جب بزعمِ خویش وہ یہ سمجھنے لگا ہے کہ اسلامی علم سے وہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ یورپ کی یہ غلط فہمی تھی، اور ہے کہ قرآنی علم صرف مسلمانوں کے لیے ہے، اور اِسی غلط فہمی میں ہم مسلمان خود مارے گئے کہ قرآنی علم صرف اور صرف، ہمارے ہی لیے ہے۔ نہیں نہیں، بالکل نہیں بلکہ قرآنی علم تو ساری بنی نوعِ انسان کے لیے ہے کہ اُس کا نازل کرنے والا بنی نوعِ انسان کا رب ہے اور جس پر نازل ہُوا، وہ صرف ایک عرب ہی نہیں بلکہ ساری بنی نوعِ انسان میں سے چنیدہ و برگزیدہ انسانِ کامل ؐ ہے۔ وہ عرب کا نہیں، بنی نوعِ انسان کا نمائندہ ہے۔ اُسے جو کچھ دیا گیا، بنی نوعِ انسان کے نمائندے کی حیثیت سے دیا گیا اور بنی نوعِ انسان کے لیے دیا گیا اور اُس نے نہایت ایمانداری سے اُسے بنی نوعِ انسان کے سامنے رکھ دیا۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن اگر کسی ایک

قوم، کسی ایک خطّے کے لیے ہوتا تو اُس کا حشر بھی وہی ہوتا، جو آج تورات، انجیل اور دوسرے آسمانی صحیفوں کا ہے۔ قرآن اگر آج لفظاً بہ لفظاً اور حرف بحرف محفوظ ہے تو اِسی لیے کہ کسی مخصوص قوم کسی مخصوص خطّے کے لیے نہ تھا اور نہ ہے۔ یہ ارض و سما کے خالق کا پیغامِ ازلی و ابدی، ساری بنی نوعِ انسان کے لیے ہے اور اب بنی نوعِ انسان پر ہے کہ اُس کے علم کی روشنی میں کون سی قوم جہالت و تاریکی کو دور کرتی، اِرتقائی منزلیں طے کرتی، اُس عروج کو پہنچتی ہے، جو قرآنی علم کی منزل و مقصود ہے۔

کُفارِ مکہ ستا چکے، مشرکینِ طائف ظلم کی انتہا کر چکے تو اللہ نے اپنے بندے کا رخ اُن کی طرف پھیر دیا، جن کے مُقدّر میں یہ نعمت عظمےٰ لکھی جا چکی تھی، یثرب والوں کی روحیں، مکہ والوں سے زیادہ سعید تھیں کہ اُن میں سے چھ نے عقبہ کے مقام پر جب حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اللہ کی باتیں سنیں تو اللہ والے بن گئے اور انھوں نے یثرب والوں کو یہ خوش خبری جا سنائی کہ ہمارے شہر کے یہودی جس "آنے والے" کا ذکر کرتے تھکتے نہیں، وہ آگیا ہے۔ ہمارے کانوں کو اُس کا کلام سننے کا شرف اور ہماری آنکھوں کو اُس کے دیدار کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ چنانچہ اگلے برس یعنی ۱۲ سنہ بعد بعثت میں یثرب کے بارہ۱۲ اور سعیدوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اِن شرائط پر بیعت کی کہ وہ "خدائے واحد کی عبادت کریں گے اور کسی کو اُس کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ چوری اور زناکاری سے دور رہیں گے، اپنی اولاد خواہ وہ لڑکیوں ہی ہوں کو قتل نہیں کریں گے، نہ کسی پر جھوٹی تہمت لگائیں گے اور نہ کسی کی چغلی کھائیں گے اور ہر اچھی بات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں گے"۔

ان ایمان والوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک ایسا صحبت یافتہ بھی کر دیا، جو اپنے گھرانے کی امارت کو تج کر اسلام کا شیدائی بن چکا تھا۔ وہ مصعب بن عمیرؓ تھے، جن کے سپرد یثرب میں اسلام کی تبلیغ کا کام ہُوا۔ حضرت مصعبؓ نے اسلام کا چرچا انصار کے تمام قبیلوں میں پھیلایا، جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اگلے برس ذی الحجہ ۱۳ سنہ بعد بعثت (جون / جولائی ۶۲۲ء) میں ۷۳ مرد اور دو۲ عورتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کو

یثرب کے قافلے کے ساتھ آئیں اور انہوں نے نہ صرف بیعت ہی کی بلکہ حضورؐ کو یثرب تشریف لانے کی دعوت بھی دی۔ یہی وہ موقعہ تھا جب ابو الہیثمؓ نے عرض کیا "رسول اللہ! ہم سے اور یہود سے تعلقات ہیں۔ بیعت کے بعد یہ تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔ ایسا تو نہ ہو کہ جب آپؐ کو قوت و اقتدار حاصل ہو جائے تو آپؐ ہم کو چھوڑ کر اپنے وطن چلے جائیں؟" آپؐ نے مسکرا کر فرمایا "نہیں تمہارا خون میرا خون ہے، تم میرے اور میں تمہارا ہوں"۔ [1]

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یہ وعدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کس خوبصورتی سے نبھایا کہ آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ والوں کے ہیں اور مدینہ والے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے زندہ اور پائندہ ہیں۔

بیعتِ عقبۂ ثانیہ کے بعد ایک خاصی تعداد ایمان والوں کی یثرب میں ہو گئی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو ہجرت کی اجازت دے دی۔ رفتہ رفتہ اکثر و بیشتر صحابہ کرام ہجرت کر گئے، سوائے اُن کمزور مرد عورتوں اور بچوں کے جو مفلس و مجبور تھے یا پھر حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی رہ گئی، جو حکمِ خداوندی کی منتظر تھی۔

اِدھر قریشِ مکہ نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کی اکثریت تو یثرب کو ہجرت کر گئی، دو چار جان نثاروں کی موجودگی ایسی نہیں، جو اُن کے ارادے کی راہ میں رکاوٹ بن سکے، تو کفار کے گڑھ دار الندوہ میں ابو جہل کی اِس رائے پر اتفاق ہو گیا کہ "ہر قبیلہ سے ایک شخص انتخاب ہو اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر تلواروں سے اُن (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کا خاتمہ کر دے۔ اِس صورت میں اُن کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا، اور آلِ ہاشم اکیلے تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے"۔ [2]

---

[1] سیرت النبی جلد اوّل ص ۲۷۰

[2] سیرت النبی، جلد دوم ص ۲۷۴

اِدھر کُفّارِ مکّہ جب یہ طے کر چکے، اُدھر اللہ اپنے پیغمبر کو، ہجرت کی اجازت دے چکا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکرؓ سے معاملہ طے کر چکے تھے مگر ہجرت کی رات وہی طے ہوئی، جو کُفّار نے انتہائے ستم کے لیے طے کی تھی، جس سے شاید یہ بتانا مقصود تھا کہ اللہ کا نبی کُفّار سے ڈر کر نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے اُن کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہوا گیا تھا، اور اُس کے بستر پر آج جو سویا ہے، وہ سویا نہیں بلکہ اُس نے تو تا ابد اپنے مقدر کو جگا لیا کہ کل کو اُسے ہی دامادِ رسولؐ بننے کا شرف حاصل ہونے والا ہے، اور اُس کی نسل سے ایسے ایسے گوہر ہائے گرانمایہ وجود میں آنے والے ہیں، جو اہلِ بیت اور آلِ رسول کہلانے والے ہیں، یہ وہ شرف ہے، جو رسولؐ کے کسی داماد کے حصے میں بھی نہ آیا۔

آج مکہ کے شقی القلب فرزندوں نے سنگدلی کی انتہا کر دی اور انہوں نے اپنے ایک ایک قبیلے کے بہادر کے ماتھے پر بزدلی کا داغ ہمیشہ کے لیے ثبت کر دیا کہ وہ ایک نہتّے انسان کو تہ تیغ کرنے کو اُس کا در بند کئے کھڑے ہیں، اور یہ نہتّا انسان وہ ہے جس نے زندگی کے تیرپن ۵۳ برس ان میں گزارے ہیں اور اُن کے کسی ایک نہتّے پر بھی ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ جس نے مسلسل تیرہ برس اُن کا ہر ظلم و ستم سہہ مگر اُن کے کسی کمزور سے کمزور پر بھی زیادتی نہیں کی بلکہ یہ اُنہیں تیرہ برس سے ہر زیادتی سے منع کرتا آیا ہے کہ اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کی پرستش نہ کرو کہ یہ عظمتِ آدم کی توہین ہے اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن نہ کرو کہ یہ عورت کی توہین ہے، اپنے غلاموں اور زیر دستوں پر ظلم نہ کرو کہ یہ انسان دوستی کی توہین ہے، نشے سے اپنے قوائے فکری کو مختل نہ کرو کہ یہ عقلِ انسانی کی توہین ہے مگر یہ ہیں کہ اُس کی ایک بھی بات ماننے کو تیار نہیں اور اگر آج یہ اُن کی طرف ہجرت کرنا چاہتا ہے، جو اُس کی باتوں کو مان کر ہر قسم کی زیادتی سے دست کش اور ہر قسم کی توہین سے کنارہ کش ہو چکے ہیں، تو یہ ظالم اُسے جانے بھی نہیں دیتے۔

اللہ اور اُس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں کہ نکالنے والے نے اپنے نبیؐ کو کس تدبیر

سے نکالا اور نکلنے والا بارہ[12] تلواروں کی چھاؤں سے کیسے اور کیونکر نکل گیا۔ تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ رات کے کسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکلے، حضرت ابوبکرؓ کو اُن کے گھر سے لیا اور مکہ کو الوداع کہتے ہوئے فرمایا اور اے مکہ! خدا کی قسم، تو مجھے خدا کی زمین میں سب سے زیادہ محبوب ہے، اور خدا کو بھی اپنی زمین میں تو ہی سب سے بڑھ کر محبوب ہے، اگر تیرے باشندوں نے مجھے نہ نکالا ہوتا، تو میں کبھی تجھے چھوڑ کر نہ نکلتا"۔[1]

آپؐ کی جگہ کوئی بھی دوسرا ہوتا، تو اُس شہر پر آخری نظر ڈالتا ہوا کیا کہتا؟ جس میں مسلسل تیرہ برس اُسے طعن و تشنیع، سب و شتم سے زدوکوب تک سب کچھ سہنا پڑا، اور انتہائی تکلیفیں و صعوبتیں اُٹھانا پڑی ہوں۔ جس کا ایک ایک بسنے والا اُس کے خون کا پیاسا ہو چکا ہو اور جس کے دروازے پر بارہ آدمی اِس وقت بھی اُس کے قتل کے ارادے سے ننگی تلواریں سُونتے کھڑے ہوں، لیکن نہیں، ایک جُملہ، ایک لفظ نہیں برائی کا، جو زبان سے نکلا ہو، کیونکہ معلوم ہے کہ یہ اللہ کا پسندیدہ شہر ہے اور اِسی شہر میں وہ عزت والا مقام بھی ہے، جسے بیتُ اللہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

رات کے اندھیرے میں آپؐ ثور کی پہاڑی کا رخ کرتے ہیں، جس کے غار نے تین) دن اور تین رات آپؐ کو پناہ دے کر پہاڑیوں میں اپنا نام بلند کر لیا۔ چودہ سو برس سے آپؐ کے غلاموں کی بوسہ گاہ بنی ہوئی ہے اور تاقیامت بنی رہے گی۔

قرآن نے اِس واقعہ کی شہادت یوں دی ہے "اگر تم (مسلمان) اُس کی (یعنی اللہ کے نبیؐ کی) مدد نہ کرو گے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ اُس کی مدد اُس وقت کر چکا ہے، جب اُسے کافروں نے نکال دیا تھا، جب وہ دو میں کا ایک تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ

---

[1] سیرتِ سرورِ عالم جلد دوم ص ۷۲۵

ہے" (التوبہ)

غار کا یہ ساتھ ایسا پکا ہُوا کہ رُوے زمین پر قیامت تک کے لیے ساتھ بن گیا ہے۔ صدیقِ اکبرؓ نے غارِ ثور کے ساتھ کے لیے تمنا کی اور اجازت چاہی تھی اور وصال کے وقت بھی وصیت کی کہ "میری میت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درِ دولت پر رکھ دینا، اگر اجازت ملے تو پہلو میں دفنا دینا، ورنہ عام مسلمانوں کے قبرستان البقیع میں" چنانچہ نمازِ جنازہ کے بعد وصیت کے مطابق جسدِ خاکی کو درِ اقدس پر رکھ دیا گیا، تو اندر سے آواز آئی "حبیب کو حبیب سے ملا دو"!

اِسراء و معراج کے حق سچ کی پہلی شہادت حضرت ابوبکرؓ کی تھی، جس پر انہیں صدیق کا لقب عطا ہُوا۔ ۹ھ میں غزوۂ تبوک کے موقعہ پر سارا اثاثُ البیت قدموں میں ڈھیر کر کے اپنے صدق وصفا کا ثبوت دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ کریمی ملاحظہ ہو کہ وصال کے بعد بھی غارِ ثور کے ساتھی کے ساتھ کو نہیں بھولے اور "حبیب کو حبیب سے ملا دو" کے فرمان سے اپنی چاہت کا اظہار فرما کر قیامت تک کے لیے ساتھی بنا لیا۔

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ کُفّار، حضورؐ کی تلاش میں جب غارِ ثور پر پہنچے تو اُس کے دہانے پر مکڑی نے جالا تن رکھا تھا اور کبوتروں کے جوڑے نے انڈے دے رکھے تھے، جس سے کُفّار نے یہ اندازہ لگایا کہ اِس غار میں کون چھپا ہو سکتا ہے، جس کے دہانے پر جالا تنا ہُوا ہے اور کبوتر انڈے سِی رہے ہیں اور لوٹ گئے تھے۔ غار کے دہانے پر کُفّار کے پہنچ جانے کی شہادت تو قرآن نے بھی دی ہے۔ اللہ کے قول سے سچا اور سُچا قول کس کا ہو سکتا ہے اور اِس بات کے تسلیم کر لینے میں عقل کو بھی عار نہیں ہو سکتی کہ غار پر اُنہیں کوئی علامت ضرور ایسی نظر آئی ہو گی، جس نے اُنہیں یہ یقین کر لینے پر مجبور کر دیا کہ غار خالی ہے، ورنہ قریش اپنے کھوجیوں کی معیت میں سراغ لگاتے ہوئے غار کے دہانے پر آن پہنچے تھے، تو اُس کے اندر جھانک لینے میں اُنہیں کیا دقت

محسوس ہوتی تھی۔ بعض سیرت نگاروں کا یہ قول (کہ غار کے دہانے پر اُمیہ بن خلف نے کہا ور یہاں کیا پاؤ گے؟ اِس غار پر تو مکڑی کا جالا محمدؐ کی پیدائش سے بھی پہلے کا تنا ہُوا معلوم ہوتا ہے [1]) مان لینا قرینِ قیاس ہے کہ یہی کچھ تھا، جس سے کفّارِ مکہ اپنی عقل و دانش پر بھروسہ کرتے ہوئے لوٹ گئے تھے، حالانکہ اُن کی فہم و فراست تو کل رات ہی اندھی ہو گئی تھی۔ جب خدا کا رسولؐ اُن کی تلواروں کی چھاؤں میں سے صاف نکل گیا تھا۔

عقل و دانش کی راہ نمائی کے اِس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عقل منزل کی راہ نمائی کر تو سکتی ہے، مگر منزل تک رسائی اُس کے بس سے باہر ہے کہ وہ تو عشق کا کام ہے۔ اللہ کے اِن دشمنوں کی رسائی صادقؐ و صدیقؓ تک کیونکہ ممکن تھی کہ صادقؐ تو غار میں اللہ سے لو لگائے بیٹھا اور صدیقؓ صادقؐ کی حفاظت کے غم میں گھلا جا رہا تھا اور حبیبِ صادقؐ نے یہ کہا "غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے"، تو صدیقؓ کا سارا غم جاتا رہا تھا کہ صادقؐ تو ہمیشہ ہی سے سچی خبریں دیتا آیا تھا، تو پھر یہ خبر کیونکر غلط ہو سکتی تھی۔

اُمتِ مسلمہ کی تاریخ کا یہ اہم موڑ، مومنوں کو یہ سبق بھی دیتا ہے کہ بظاہر کمزور ترین نظر آنے والی حقیر سی شے، دشمنوں کی راہ میں کبھی ایسا حصنِ حصین بن جاتی ہے، جسے وہ پار نہیں کر سکتے۔ آج مکڑی کے جالے نے وہ کام کیا تھا، جو شاید مضبوط ترین قلعہ بھی نہ کر سکتا، کیونکہ غیض و غضب سے پھنکارتے ہوئے کفّار کا قلعے کے کسی مضبوط پھاٹک کو توڑ ڈالنا بعید نہ تھا، لیکن مکڑی کا حقیر سا جالا توڑ دینا اُن کے لیے ممکن نہ رہا تھا، کیونکہ اللہ اُس کی مدد پر تھا، جسے کافروں نے نکال دیا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے قبل کے پیغمبروں کی اُمّتوں نے جب اپنے نبیوں پر سب و شتم روا رکھا، خدائے واحد کی عبادت کرنے سے انکار کیا (جس کی تعلیم وہ دیتے تھے) اور اُنہیں اپنی بستیوں سے نکال باہر کیا تو اُن اُمتوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا، لیکن آج سب نبیوں کے سردار کو قریشِ مکہ نے اُسی طرح نکال باہر کیا، جس طرح حضرت نوحؑ

---

[1] سیرت سرورِ عالم جلد دوم ص ۴۷

کی قوم نے اُنہیں نکل جانے پر مجبور کر دیا تھا، اور جب وہ نکلنے کی تیاری میں کشتی بنا رہے تھے تو اُن پر طعن و تشنیع کرتے اور اُن کا ٹھٹھا اُڑاتے تھے کہ خشکی پر کشتی بنانا کیا معنی؟ حضرت صالحؑ کی قوم نے صرف اُس اُونٹنی کو ہی ہلاک کیا تھا، جو ایک دن چھوڑ کر اپنی باری پر اُس کنویں سے پانی پیا کرتی تھی، جس سے اہلِ مدائن پانی لیا کرتے تھے، لیکن یہاں تو کفّارِ مکہ، اللہ کے نبی ہی کو ہلاک کر دینا چاہتے تھے اور جب وہ اپنے اللہ کی مدد سے اُن کی تلواروں کی زد سے بچ نکلا تھا، تو اُس کا تعاقب کرتے ہوئے، اُس غار تک آن پہنچے تھے، جس میں وہ پناہ لیے ہُوا تھا، اور اِسی طرح حضرت لوطؑ نے جب اپنی قوم کو ہم جنس پرستی سے روکا تھا، تو انھوں نے برملا کہا تھا کہ اِن لوگوں کو اپنی بستیوں سے نکال دو، جو بڑے پاک باز بنتے ہیں مگر یہاں تو پاکوں کے پاکؐ کو مکّہ کے مشرکوں، کافروں، شرابیوں، زانیوں اور اولاد کے قاتلوں نے نوک تلوار پر دھر لینا چاہا تھا، تو پھر مکہ کیوں تباہ نہ ہُوا، کیوں اس کی اینٹ سے اینٹ نہ بجادی گئی، جیسا کہ سدوم کی، یہ اس لیے نہ ہُوا کہ جو نبی مکہ والوں کی طرف بھیجا گیا تھا، وہ صرف مکہ والوں ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام روئے زمین کے لیے سایۂ رحمت بن کر اور اُس میں بسنے والے کیلئے پیغام امن لے کر آیا تھا۔

اے امن امن کے نعرے لگانے والے مغرب کے عیسائیو اور مشرق کے دہریو! اے عیسیٰؑ کے پیروکارو اور مارکس و لینن کے ثنا خوانو! آج یہ تو بتاؤ کہ انسانی تاریخ میں کوئی ایسا بڑا بھی گزرا ہے، جس پر طائف جیسا ستم کناں، خونچکاں اور ذلت فشاں دن گزرا ہو اور اُس کے منہ سے ایک بھی بے ہودہ کلمہ نہ نکلا ہو اور جنہوں نے اُس پر ایسا ستم ڈھایا ہو کہ پنڈلیوں کا خون بہہ بہہ کر جوتوں میں جم گیا ہو اُن کے لیے بھی بد دعا کا ایک کلمہ نہ کہا ہو!

تمہارے پاس اگر جواب نہیں، تو سنو! محمدؐ کے سے نبی اور بھی گزرے ہیں، جن کی ثنا خوانی محمدؐ ہی پر اُترے قرآن نے کی ہے۔ اُن کی قوموں نے بھی اُن پر ستم ڈھائے۔ اُن کے اوباشوں نے بھی اُن کی ہنسی اُڑائی، لیکن جب اُن کی قوموں نے اُنہیں اُس

حالت کے قریب پہنچایا، جس حالت کو آپؐ طائف میں پہنچے تو اللہ نے انہیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ قومِ نوحؑ کو غرقاب کر دیا گیا اور نوحؑ کی کشتی اُن چند لوگوں کو لیے کوہِ جودی پر جا لگی، جو اُن پر ایمان لائے تھے اور اللہ نے اُن کی قوم کے حق میں فیصلہ دیا کہ "دُور ہوئی ظالموں کی قوم"۔

نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ کو قومِ عاد کی طرف بھیجا گیا مگر انہوں نے بھی قریشِ مکہ کی طرح خدائے واحد کی عبادت سے انکار کر دیا اور قومِ نوحؑ کی طرح کہا کہ "وہ عذاب لے آ، جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے"، چنانچہ اُن کے ساتھ بھی وہی ہُوا جو قومِ نوحؑ کے ساتھ ہُوا تھا۔ اُن پر ایمان لانے والوں کو بچا لیا گیا اور باقیوں کی بالفاظِ قرآن "جڑ کاٹ دی گئی"۔

حضرت ہودؑ کے بعد حضرت صالحؑ کو قومِ ثمود کی طرف ہدایت کو بھیجا گیا (یہ وہ قوم تھی، جس کی بستیوں کے کھنڈر آج بھی اچھی خاصی حالت میں برباد شدہ حجاز ریلوے لائن کے اسٹیشن مدائن صالح کے قریب ہیں، جو مدینہ اور تبوک کے درمیان ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کے موقع پر اُن کھنڈرات کی نشان دہی کی تھی اور اُس کنویں کا پتہ بھی بتلایا تھا، جس سے حضرت صالحؑ کی اونٹنی پانی پیا کرتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اُس کنویں کے علاوہ دوسرے کنوؤں کا پانی پینے سے منع فرما دیا تھا (تبوک اِن دنوں سعودی عرب کی فوجی چھاونی ہے اور خاصی آباد جگہ ہے)۔

قومِ ثمود نے بھی حضرت نوحؑ اور حضرت ہودؑ کی قوموں کی طرح اپنے نبی حضرت صالحؑ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا، اور اُس اونٹنی کو بھی ہلاک کر دیا، جو بطورِ اللہ کی ایک نشانی کے اُن میں چھوڑی گئی تھی اور اُسی طرح عذاب کا مطالبہ کیا، جس طرح دوسرے دونوں پیغمبروں کی قوموں نے کیا تھا، سو انہیں بھی ایک زبردست بھونچال نے ایسے ہلا مارا کہ گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔

حضرت صالحؑ کے بعد قرآن ہمیں حضرت لوطؑ کی قوم کی بربادی کی خبر دیتا ہے۔

(حضرت لوطؑ، حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے، جنہیں سدوم کے علاقے میں نبی بنا کر بھیجا گیا تھا) یہ بدفطرت قوم ہم جنس پرستی میں بتلا تھی۔ جب انہیں اس فعل بد سے ٹوکا گیا تو انہوں نے حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں سے متعلق کہا کہ "ان لوگوں کو اپنی بستیوں سے نکال دو، جو بڑے پاک باز بنتے ہیں" جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم پر پتھروں کی بارش برسائی گئی، شاید کوئی آتش فشاں پہاڑ تھا، جو ان پر پھٹ پڑا تھا، اور یہ قوم نیست و نابود ہو گئی تھی۔

حضرت شعیبؑ نے جب اپنی قوم کو شرک سے باز رہنے اور ناپ تول کو درست کرنے کو کہا، تو انہوں نے بھی قوم لوطؑ کی طرح ان کو اپنی بستی سے نکال دینے کی دھمکی دی اور ان کا انجام بھی وہی ہوا، جو قوم لوطؑ کا ہوا تھا، یعنی کسی زلزلے یا کسی پہاڑ کی آتش فشانی نے انہیں آن لیا تھا، اور وہ ایسے مٹے کہ ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔

مکہ اور طائف میں بھی یہ سب کچھ ہو چکا تھا، جو اقوام نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ اور شعیبؑ نے اپنے اپنے پیغمبروں کے ساتھ کیا تھا، مگر یہاں یہ ہوا کہ متمردانِ مکہ اور جبّارانِ طائف کو از خود مٹانے سے پہلے اللہ نے یہ کام اپنے نبی کے سپرد کر دینا چاہا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم طائف کے اوباشوں کی سنگ باری سے خون آلود اور ہراساں ہو کر جدھر منہ اٹھا، ادھر چل پڑے اور طائف سے تھوڑا باہر قرن المنازل پر پہنچے (یہ جگہ اب اہلِ نجد کی میقات ہے، جہاں سے وہ حج اور عمرہ کے لیے احرام باندھتے ہیں) تو دیکھا (بروایت مسلم حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں) کہ "ایک ابر میرے اوپر سایہ کئے ہوئے ہے، پھر دیکھا کہ اس میں جبریلؑ ہیں۔ انہوں نے پکار کر مجھ سے کہا "اللہ نے وہ سب کچھ سن لیا، جو آپؐ کی قوم نے آپؐ سے کہا اور آپؐ کی دعوت کا جو جواب آپؐ کو دیا۔ یہ پہاڑوں کا فرشتہ اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے، تاکہ آپ جو چاہیں اسے حکم دیں۔ پھر پہاڑوں کے فرشتے نے پکار کر مجھے سلام کیا، اور اس کے بعد مجھ سے کہا

"اے محمدؐ ! اللہ نے آپؐ کی قوم کا قول اور آپؐ کی دعوت پر اُس کا جواب سن لیا ہے۔ میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں۔ مجھے آپؐ کے پاس بھیجا ہے تاکہ آپؐ اپنا حکم مجھے دیں۔"[1]

آپؐ نے مکہ اور طائف کی آبادیوں کو جو پہاڑوں و پہاڑیوں میں گھری ہوئی ہیں۔ ان ہی پہاڑوں کے پتھروں سے قومِ لوطؑ اور قومِ شعیبؑ کی طرح نیست و نابود کروا دینے کی بجائے فرمایا " نہیں، میں اُمید رکھتا ہوں کہ اللہ اِن کی پُشتوں سے ایسے لوگ پیدا کرے گا، جو اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کریں گے۔"[2]

یہ واقعہ جہاں اللہ کا اپنے جزوی اختیارات وقتی طور پر بندۂ مومن کے ہاتھ سپرد کر دینے کی دلیل ہے، وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃٌ للعالمین ہونے کا بھی بیّن ثبوت ہے، اور اس امر کا بھی شاہد ہے کہ وہؐ جو انسانِ کامل اور نبی اکملؐ تھا، اُس نے اپنے افضل و اکمل ہونے کا ثبوت بھی بہم پہنچا دیا کہ ایک انسانِ کامل اور نبی اکمل بنی نوع کے بدترین لوگوں کی بھی تباہی و بربادی پر رضامند نہیں ہوتا۔ آپؐ کا یہی وہ خلقِ عظیم تھا، جس پہ اللہ نے بھی گواہی دی ہے۔

مکّہ کے کُفّار جس گوہرِ نایاب کی تلاش میں تھے، وہ تو اُسی صدفِ ثور میں چھپا رکھا تھا، جس ثور (بیل) کے سینگوں سے ٹکرا کر وہ لوٹ چکے تھے اور اُس کی معیّت میں ایک ایسا گوہر بھی تھا، جو اُس کی صحبت سے فیض یاب ہو کر اسلام کا گوہرِ گرانمایہ بننے والا تھا۔ اِدھر صدیقؓ کے فرزندِ ارجمند عبداللہ، جو دن میں قریش کے مشوروں کی گن سن لیتے رہتے، ثور کے مکینوں کو حالات سے آگاہ کرتے رہتے تھے تین دن تک قریش جب غیظ و غضب میں اپنی انگلیاں دانتوں سے کاٹ کاٹ کر تھک چکے اور بہ ڈھنڈورا پیٹوا کر بیٹھ گئے کہ صادقؐ اور صدیقؓ کو پکڑ کر لانے والے

1۔ سیرت سرورِ عالم جلد دوم صـ ۶۳۵
2۔ سیرت سرورِ عالم جلد دوم صـ ۶۳۵

کو سو یا دو سو اونٹ انعام دیئے جائیں گے، تو وہ دونوں جو تین شب و روز ثور کے غار میں گزار چکے تھے، تیسری رات کے آخری حصے میں اُس شہر کی طرف روانہ ہوئے، جو یثرب سے مدینۃ النبی کہلانے والا اور مومنوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک بننے والا تھا۔

عبداللہ بن اُریقط، جسے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے راستے کی نشاں دہی کرنے کو پہلے سے اجرت پر مقرر کر رکھا تھا، اِس مختصر سے قافلے کو لیے چل نکلا۔ راستے میں کام کاج کے لیے حضرت ابوبکر رضؓ نے اپنے غلام عامر بن فہیرہ کو اپنے ساتھ اُونٹنی پر بٹھا لیا تھا۔ عام راستے سے ہٹ کر یہ قافلہ دوسرے دن دوپہر تک چلتا رہا اور دوپہر کے وقت ایک چٹان کے سایے میں آرام کیا۔ اسی سایے میں آرام لینے کو آن نکلے ایک چرواہے سے بکری کا دودھ لے کر اپنی تشنگی و گرسنگی کو فروع کرنے کا سامان کیا۔ سورج جب ڈھل چکا تو یہ قافلہ پھر سے روانہ ہُوا، تو سُراقہ بن جعشم اِسی قافلے کو تلاش کرتا ہُوا آن پہنچا، جسے قریش کے اِس اعلان کی خبر مل چکی تھی کہ صادق ؐ اور صدیق رضؓ کی جان کی قیمت سو، سو اونٹ مقرر ہو چکی ہے۔

قریشِ مکہ بصیرت و بصارت سے محروم تھے کہ دُرِ نایاب کی حقیقت کو تیرہ برس تک نہ پا سکے، لہٰذا اُنہیں نظر کا دھوکا دیا گیا کہ مکڑی کا حقیر جالا اُن کے لیے سدِ سکندری بن گیا۔ یہاں سُراقہ تیر و ترکش لیے ایسے شکار کو نکلا تھا، جس کی نخچیر ساری دنیا بننے والی تھی، وہ اپنے ہدف کو پہچان کر لپکا ہی تھا کہ گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور سُراقہ تیر و ترکش سمیت زمین پر آ رہا۔ اپنے عقیدے کے مطابق اُس نے ترکش سے تیر نکال کر فال دیکھی تو بے زبانوں نے بھی زبانِ حق سے بات کی کہ آگے مت بڑھو! لیکن سو دو سو اونٹ ایک بدو کے لیے ایسا خزانۂ قارون تھے، جس سے تیر کی بات مان کر دست بردار نہیں ہُوا جا سکتا تھا، لہٰذا گھوڑے پر سوار ہو کر پھر لپکا تو اُس سخت زمین میں اُس کا گھوڑا گھٹنوں تک دھنس گیا، جس پر یہ مختصر سا قافلہ چلا جا رہا تھا۔ صحرائی لوگ طبعاً زیرک ہوتے ہیں، لیکن جب سخت زمین پر ایک بیوقوف کا گھوڑا بھی گھٹنوں تک دھنس جائے، تو

اُس کی کم عقلی بھی خطرے کی سنگینی سے اُسے مطلع کر دیتی ہے، سو اِس صحرائی بدّو نے زیرکی سے کام لیا اور پکار کر امان مانگ لی اور وہؐ جو ساری دنیا کو امن و امان دینے کو مبعوث ہُوا تھا، سُراقہ کو کیونکر امان نہ دیتا۔

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عامر بن فہیرہ سے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر سُراقہ کی طلب پر امان نامہ لکھوا دیا، تو درست ہی لکھا ہو گا، لیکن کوئی یہ تو بتلائے کہ حضورِ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس کو قول دیا، جو پورا نہ کیا اور پورا نہ ہُوا۔ اِسی واقعے سے ظرفِ عالی ملاحظہ ہو کہ سُراقہ کو انعام سے محروم نہیں رکھا۔ سراقہ جب امان نامہ لے کر لوٹنے لگا تو فرمایا "وہ بھی کیا وقت ہو گا، جب تم کسریٰ کے کنگن پہنو گے"[1]

شوال ۸ھ میں معرکہ حنین کے بعد جب جعرانہ میں مالِ غنیمت تقسیم ہُوا، تو سُراقہ وہی امان نامہ لیے حاضر ہُوا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آج وفائے عہد اور ادائے حق کا دن ہے، قریب آجاؤ"[2]

سُراقہ اُس دن مسلمان ہُوا، اور انعام و اکرام سے بھی ضرور نوازا گیا ہو گا۔

حضرت عمرؓ کے عہد صفر ۱۶ھ میں جب حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کے ہاتھوں ایران کا پایۂ تحت مدائن فتح ہُوا، تو شاہی خزانے میں صدیوں کی جمع شدہ دولت اور زر و جواہر کے ذخائر، نوشیرواں کا ملبوس شاہی اور ایران کا تاریخی فرشِ بہار حضرت عمرؓ کے پاس مدینہ بھجوا دیئے"[3]

حضرت عمرؓ نے سُراقہ کو بلایا اور اُسے کسریٰ شاہ ایران کے کنگن، کمر پٹہ اور تاج پہنایا اور کہا "ہاتھ اُٹھاؤ اور کہو "تعریف اُس خدا کی، جس نے یہ چیزیں اُس کسریٰ بن ہرمز سے چھین لیں، جو کہتا تھا کہ میں لوگوں کا رب ہوں اور اُنہیں بنی مدلج کے ایک بدّو سُراقہ بن

---

[1] سیرتِ سرورِ عالم، جلد دوم ص ۷۴۲

[2] سیرتِ سرورِ عالم جلد دوم ص ۷۴۲

[3] تاریخِ اسلام مولفہ شاہ معین الدین احمد ندوی حصہ اوّل ص ۱۶۹-۱۶۸

مالک بن جعشم کو پہنا دیا"۔[1]

ہجرت کے سفر میں کیا ہُوا وعدہ، صفر ۱۶ھ میں پورا ہُوا، نہ صرف یہ کہ سُراقہ نے کسریٰ کے کنگن پہن لیے، بلکہ تاریخ کے اوراق نے بھی یہ بات اپنے سینے پر رقم کر لی کہ وہ جو مکہ میں چالیس برس تک صادق و امین کہلاتا رہا، وہ جو مدینہ میں بھی دس برس صادق و امین کہلایا، وہ وصال کے پانچ برس بعد اُسی قدر صادق و امین نکلا تو پھر وہ پانچ سو یا پانچ ہزار برس بعد بھی کیونکر صادق و امین نہ کہلائے گا۔ یہ اُسی کی عظیم صداقت و امانت کی طفیل ہے کہ ہجرت کے چودہ سو برس بعد آج صرف برِصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کے ایک چھوٹے سے خطۂ ارض پر ہی اُس کی صداقت و امانت کے گواہ اٹھائیس کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ صدیاں جوں جوں گزریں گی، اُس کی عظیم صداقت و امانت کا بول بالا جو ہوگا، اُس کا اندازہ تو اللہ کے علم میں ہے، جس کا وہ رسولؐ ہے مگر گزرے چودہ سو برس جو بتلاتے ہیں، اُنہیں کون جھٹلا سکتا ہے؟

تین شب و روز غارِ ثور میں گزارنے کے بعد ہجرت کا سفر غارِ ثور سے یکم ربیع الاوّل (۱۶ ستمبر ۶۲۲ء) کو شروع ہُوا، اور آٹھ ربیع الاوّل (۲۳ ستمبر ۶۲۲ء) کو قبا پر ختم ہُوا۔[2]

بعض سیرت نگاروں نے یکم ربیع الاوّل کو مکہ سے نکلنے، ۴ ربیع الاوّل غارِ ثور سے مدینہ کے لیے روانگی اور ۱۲ ربیع الاوّل بوقت دوپہر مدینہ پہنچنے کی تاریخ بیان کی ہے۔[3]

بہر طور آٹھ دنوں کے اِس سفر میں ایک اور واقعہ جس کا اکثر سیرت نگاروں نے تذکرہ کیا ہے، وہ اُمِّ معبد کے خیمہ میں آپؐ کا ستانا ہے۔ یہ ذکر ہر سیرت نگار نے شاید اِس لیے کیا ہے کہ وہاں جو کرامت یا معجزہ آپؐ سے سرزد ہُوا، اُس کا ذکر ہو سکے۔ وہ یوں ہے

۱؎ سیرت سرورِ عالم جلد دوم ص ۴۳۲

۲؎ رحمۃ للعالمین حصہ اوّل ص ۹۱-۸۷

۳؎ سیرت سرورِ عالم جلد دوم ص ۴۳۷-۴۳۶

کہ "خیمے کے ایک کونے میں ایک بکری کھڑی تھی ، جو بقول اُمّ معبد کے اِس لیے ریوڑ کے ساتھ چرنے نہ جا سکی تھی کہ لاغر و کمزور تھی" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت لے کر اُس بکری کو دوہنا شروع کیا ، جس سے ایک بڑا برتن بھر گیا ، جس سے آپؐ نے اپنی میزبان کو پلایا ، پھر ساتھیوں کو اور آخر میں خود پیا ، سب سیر ہو گئے اور اُس کے بعد بکری کو پھر دوہا اور برتن بھر کر اُمّ معبد کو دیا اور فرمایا ، جب معبد کا باپ آئے ، اُسے یہ دودھ دے دینا"۔[1]

اِس میں شک نہیں کہ ایک لاغر و کمزور بکری کا اتنا دودھ اُتار دینا ، جس سے چار آدمی سیر ہو جائیں اور دوبارہ اُسی قدر دودھ اور اُتار دینا ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں کی برکت تھی ، لیکن اُن دانشوروں کی عقل میں یہ بات آنے والی نہیں ، جو ماہرِ حیوانات ہیں ، اور جانتے ہیں کہ اِس قدر دودھ کی یافت ایک کمزور و لاغر بکری سے ممکن نہیں ، مگر وہ دانشور چاہے مشرق کے ہوں یا مغرب کے اُنہیں بنی اسرائیل کے من و سلویٰ سے بھی انکار کرنا پڑے گا ، جو ایک طویل مدت صحرائے میں اُن کی پرورش کا ذریعہ بنا رہا ، اور ضربِ عصائے موسیٰؑ سے صحرائے سینا کی چٹان سے پھوٹے اُس چشمے کی بھی نفی کرنا پڑے گی ، جو پوری قوم کو ایک مدت سیراب کرتا رہا۔

ہم مسلمان نہ تو من و سلویٰ کے واقعہ سے انکار کرتے ہیں اور نہ چشمے کے پھوٹ بہنے سے کہ قرآن نے اُن کی تصدیق کر دی ہے ، جو ہمارا جزوِ ایمان ہے ، اور نہ ہی ہم حضرت عیسیٰؑ کے اندھوں اور کوڑھیوں کو تندرست کر دینے والے واقعات سے انکاری ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے ایسے معجزے تھے ، جس کی تصدیق بھی وہی کتاب کرتی ہے ، جس نے بنی اسرائیل پر من و سلویٰ کے اُتارے جانے کی تصدیق کی ہے۔

ہم مسلمان تو مانتے ہی ہیں کہ وہ سب سچ ہے ، جو حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں

---

[1] سیرت سرورِ عالم جلد دوم صفحہ ۴۳۳

ظہور پذیر ہوا، اور وہ بھی بالکل درست ہے جو حضرت عیسیٰؑ نے اپنے پاک ہاتھوں سے سرانجام دیا کہ اللہ اپنے رسولوں کو ایسی اَن دیکھی و اَن جانی طاقتوں و برکتوں سے نوازتا آیا ہے، جو عام آدمی کا حصہ نہیں ہوتیں، لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے نبیوں کے معجزات کا تذکرہ تو بہ ملا کرتے ہیں، لیکن بات جب نبی اکملؐ پر پہنچتی ہے تو علم و عقل، تجربات و مشاہدات کی آڑ لے کر اُس سے صاف مکر جاتے ہیں، جس پر قرآن گواہ ہے، جس پر نبیِ اکملؐ کا کلام شاہد ہے اور جسے مسلمان سیرت نگاروں نے تاریخ کہا ہے۔

تاریخ دان یہ کہتے ہیں کہ چار آدمیوں کا یہ قافلہ ۸ یا ۱۲ ربیع الاوّل (۲۳ یا ۲۷ ستمبر ۶۲۲ء) کو قبا میں وارد ہوا۔ مدینہ منورہ کے نواح میں یہ وہ جگہ ہے جہاں آج مسجد قبا واقع ہے۔ واہ، واہ، سبحان اللہ! وہ کیسا چودھویں کا چاند تھا۔ جو حرّہ کی سیاہ چٹانوں سے قبا پر طلوع ہوا، اور کل عالم نے دیکھا، جس کی چاندنی چھٹکتی ہی چلی گئی، اور تا قیامت کھلتی ہی چلی جائے گی۔ اِس ماہِ چار دہم کی ضَو قرآنی جیسے جیسے جہانِ تیرہ و تار کو اُجالتی چلی گئی، ویسے ویسے مدینہ پاک کا نام بھی اسلامیانِ جہاں کے دلوں کا نور و سرور بنتا چلا گیا، اور آج قلبِ مومن کی حالت یہ ہے کہ مدینہ پاک کا نام جب بھی کسی کے لبوں پر آیا، اُسی کے ساتھ گنبدِ خضرا کا تصور دل و دماغ میں اُبھرا، اور اُس کا سر فرطِ عقیدت سے جھک گیا اور وفورِ محبتِ نبویؐ سے اُس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

مارچ ۶۸ء کا وہ کیسا مبارک دن تھا، جب پہلی بار سعادتِ حج بیت اللہ سے فیض یاب ہو کر نکہت و نور کے اِس شہر منور میں، میں نے پہلا سانس لیا تھا اور فروری ۷۲ء میں کیسی کرب ناک گھڑی تھی، جب چوتھی بار بچشمِ گریاں و دلِ بریاں اِس شہرِ جہاں تاب کے گنبدِ خضرا کے سایۂ روح پرور سے جدا ہوا تھا۔ جدائی یہ گھڑیاں پھیل کر اب ستّرہ برس پر محیط ہو گئی ہیں اور ستّرہ برس کی اِس جدائی میں جسم و جان پر جو گزری ہے، اُس کا تذکرہ یہاں اِس لیے

ضروری نہیں کہ یہ نمود و نمائش کی ضمن میں آتا ہے، اور جن کو یہ ذکرِ ہجر سنانا مقصود ہے، وہ تو حالِ دل سے بھی بے خبر نہیں۔

مدنی دور

سنہ ۱ھ تا سنہ ۵ھ

قبا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام سے متعلق سیرت نگاروں میں اختلاف ہے۔ تیئیس[۲۳]، بائیس[۲۲] اور اٹھارہ دن کے قیام کے حق میں کم، چودہ[۱۴] اور تین دن کے حق میں روایات زیادہ ہیں[۱]۔ بہر طور انہی چودہ یا تین دن کے قیام میں انہوں نے مسجد قبار کی بنیاد رکھی اور یہی وہ مقدس مسجد ہے، جس کی تقدیس قرآن نے یوں کی ہے۔

> "وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے، وہ اِس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ آپ اِس میں کھڑے ہوں۔ اس میں ایسے لوگ ہیں، جن کو صفائی بہت پسند ہے، اور خدا صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔" (توبہ — ۱۳)

جس مسجد کی تعمیر کے لیے پتھر ڈھونے والے ہاتھوں میں وہ ہاتھ بھی ہوں، جنہیں مالکِ کون ومکان نے عالمِ آب وگل کی تقدیر پلٹنے کے لیے بنایا ہوا اُس کی عظمت کا بیان کیا جانا حق تھا۔

ذرا تصور کیجیے اُن معماروں و مزدوروں کا جو پتھر اور گارے کی اِس مسجد کو بناتے

---

[۱] سیرت سرورِ عالم جلد دوم ص ۲۸ ، رحمۃ للعالمین حصہ اوّل ص ۹۱ ،
سیرت النبی جلد اوّل ص ۲۸۱

ہوئے، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کے ان شعروں میں، اُن ہی کے ساتھ آواز ملاتے چلے جاتے ہیں، اور اُن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شیریں آواز بھی شامل ہے۔

کامیاب ہے وہ، جو مسجد تعمیر کرتا ہے
اُٹھتے بیٹھتے جو قرآن پڑھتا ہے!
رات کو (عبادت میں) جو جاگتا رہتا ہے!

انہی ایام میں حضرت علیؓ کفارِ مکہ کی وہ امانتیں، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تحویل میں تھیں، لوٹا کر قباء آن پہنچتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا مکہ سے آنا اور قباء میں مسجد کی تعمیر سے یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام قباء میں چودہ دن سے کم کیا رہا ہوگا۔

قباء میں مسجد کی تعمیر کے بعد آپؐ نے جمعہ کے دن خاص شہر کی طرف رجوع کیا، اور بنی سالم کے محلے تک پہنچتے نمازِ جمعہ کا وقت ہو گیا۔ آپؐ نے یہاں نمازِ جمعہ کی امامت فرمائی یہ پہلی نمازِ جمعہ تھی، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں مدینہ میں پڑھی گئی، اور جس جگہ یہ نماز پڑھی گئی، اُس جگہ مسجد جمعہ بطور یادگار اب بھی موجود ہے۔

نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر آپؐ شہر میں جنوب کی جانب سے داخل ہوئے، تو آپؐ کے استقبال کے لیے مرد و زن، شاب و شیخ سبھی نکل آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری جوں جوں آگے بڑھتی، ہر ہر قبیلے کا سردار آگے بڑھ کر عرض کرتا، حضورؐ یہ گھر، یہ مال، یہ جان حاضر ہے، اور آپؐ کلماتِ خیر سے نوازتے آگے بڑھتے چلے جاتے۔ نواحِ شہر سے نکل کر جب آپؐ شہر میں پہنچے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہوئے انصار کی بیویاں اور بیٹیاں اپنے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر اظہارِ مسرت میں یوں گانے لگیں ؎

یہ چودھویں کا چاند نکلا ہے ہم پر
جنوب میں وداع کی پہاڑیوں سے
اللہ کا شکر واجب ہے ہم پر
جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں

بنی نجار کی چھوٹی چھوٹی بچیاں دفیں بجا بجا کر گاتی تھیں ؎

ہم لڑکیاں ہیں بنی نجار کی
جن کا اچھا ہمسایہ محمد ہے

آپ نے اِن بچیوں سے پوچھا "کیا تم مجھے چاہتی ہو"؟ بولیں، ہاں!
فرمایا "میں بھی تمہیں چاہتا ہوں"۔ [1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اِس پُر جوش خیر مقدم سے محظوظ و مسرور ہوتے آگے بڑھتے چلے گئے۔ راستے میں قبیلوں کے سردار حاضر ہو ہو کر اپنے ہاں قیام کے لیے عرض کرتے رہے اور آپ یہی فرماتے رہے کہ میری اونٹنی کا راستہ چھوڑ دو کہ یہ اللہ کی جانب سے مامور ہے، اور اُس جگہ ٹھہرے گی، جہاں اللہ کا حکم ہو گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی نکیل ڈھیلی چھوڑ رکھی تھی، جب وہ بنی مالک بن نجار کے محلے میں پہنچی تو ٹھیک اُس جگہ جا کر بیٹھ گئی، جہاں آج مسجدِ نبوی، اور بعض روایات کے مطابق منبرِ رسول ہے، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُس پر تشریف فرما رہے، وہ اُٹھی اور کچھ دُور چل کر پھر اُسی جگہ پلٹ آئی اور وہاں ٹک گئی، تب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس پر سے اُترے [2]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی جس جگہ بیٹھی، اُس سے قریب ہی حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مکان تھا [3]۔ اونٹنی سے اُتر کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ ہمارے لوگوں میں سے کس کا گھر یہاں سے قریب تر ہے۔ حضرت ابوایوبؓ نے عرض کیا "یارسول اللہ یہ سامنے میرا گھر ہے، اور یہ میرا دروازہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] سیرت النبی جلد اوّل ص ۲۸۲-۲۸۳
رحمۃ للعالمین حصہ اوّل ص ۹۵

[2] سیرت سرورِ عالم جلد دوم ص ۷۴۰-۷۴۹

[3] راقم الحروف کو مدینہ منورہ کی حاضری میں اِس مکان کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔

فرمایا "تو جاؤ اور ہمارے لیے قیلولے کا انتظام کرو"۔ ؎۱

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قیام جناب ابوایوب انصاریؓ کے یہاں سات ماہ تک رہا۔

شقاوت وسعادت میں فرق ملاحظہ ہو کہ شقی القلب قریش مکہ نے کس غرور و تمرّد میں اُس نعمتِ عظمیٰ سے ہاتھ اُٹھا لیا، جو اُن ہی کی بہتری و بہبودی، سرفرازی و سربلندی کے لیے اُنہیں بخشی گئی تھی، اور اہلِ مدینہ نے کس مہر و محبت، پیار و خلوص سے اُس نعمتِ عظمیٰ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، جو کفارِ مکہ کے ہاتھوں تیرہ برس ستائی گئی تھی، گویا وہ گوہرِ نایاب آج اہلِ مدینہ کے ہاتھ آیا تھا، جس کی تعریف و توصیف وہ مدت دراز سے سنتے آئے تھے، اور جس کی چھان پھٹک انہوں نے عقبہ کی دونوں بیعتوں میں خود کر لی تھی۔

آج وہ دن تھا کہ جس طرح یہود کی مسلسل سرکشی و تمرّد، کبر و نخوت اور آئین موسوی سے سرگردانی کی بنا پر رسالت، حضرت اسحاقؑ کے گھرانے سے چھین کر حضرت اسماعیلؑ کی اولاد کو منتقل کر دی گئی، عین اُسی طرح مکہ کے نامہربانوں، ناشکروں و نامرادوں کو دولتِ عظمیٰ سے محروم کر کے یہ عظیم دولت اُن مہربان، شکرگزار اور بامراد ہاتھوں کو سونپ دی گئی، جو اُس کی قدر و منزلت سے واقف تھے اور جنہوں نے قباء سے قلب شہر تک اِسی دولتِ عظمیٰ کی مہمانی کے حصول کے لیے جھولیاں پھیلا رکھی تھیں۔

صاحبِ دولت کا ظرف عالی و انصاف پسندی ملاحظہ ہو کہ اِس ڈر سے کہ کوئی بھی جھولی پھیلانے والا مایوس نہ ہو، اپنی اونٹنی کی نکیل یہ کہہ کر کہ "یہ اللہ کی جانب سے مامور ہے" ہاتھ سے چھوڑ رکھی تھی، گویا اپنے ارادے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا کہ جو ارادہ میرے اللہ کا ہے، وہی ارادہ میرا بھی ہے۔ ایمان والوں میں سے اب کون ایسا ہے کہ جو رسولؐ کی بات کا اعتبار نہ کرے کہ اُس کی بات کا اعتبار ہی تو ایمان ہے۔ اللہ نے اپنے نبیؐ کی اونٹنی کو بٹھایا بھی تو اُس جگہ، جو قیامت تک ایمان والوں کی سجدہ گاہ بننے والی تھی اور جس کی فضیلت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ "یہ جنت کے باغوں میں

؎۱ سیرت سرورِ عالم جلد دوم صفحہ ۴۲۷-۴۲۹

سے ایک باغ ہے"۔

یہ باغ اُس وقت ایک ویرانہ تھا کہ اس میں چند قبریں اور کھجور کے چند درخت تھے اور یہ دو یتیم بچوں کی ملکیت تھا جسے چند دن بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بقیمت خریدا، اور اسی جگہ مسجد کی بنیاد رکھی۔ سرزمین یثرب میں چند ہی دنوں میں یہ دوسری مسجد تھی، جس کی بنیاد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی۔ یہ سنگِ بنیاد رکھنا ویسا نہ تھا، جیساکہ آج کے سربراہانِ ممالک، علماء کرام اور پیرانِ عظام رکھتے ہیں کہ ہر ساز و سامان تیار، حتیٰ کہ مرمر کی تختی پر اُن کا اسم گرامی بھی کندہ شدہ، بس مسالے کی ایک کڑاہی لی اور تختی کی جڑ میں ڈال دی۔

اللہ کے دین کا یہ معمار تو وہ ہے، جو نہ صرف مسجد کی پہلی اینٹ خود رکھتا ہے، بلکہ اُس کی تعمیر کے ہر ہر مرحلے میں پتھر اور گارا بھی خود ہی اٹھاتا ہے اور اپنے صحابہ کے ساتھ مل کر گنگناتا ہوا اُن کا دل بہلاتا اور انہیں بتاتا جاتا ہے کہ مسجد کی تعمیر میں کتنی خیر و برکت ہے اور اپنے رب کو گواہ بنا کر اللہ کا گھر بنانے والوں کو بتاتا بھی جاتا ہے کہ اصل کامیابی تو آخرت کی ہے اور اُن کے لیے دعا بھی کرتا جاتا ہے۔

اے اللہ! کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے

اے اللہ! مہاجرین اور انصار کو بخش دے!

وہ مسجد جیسے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ کہا گیا ہے " کچی اینٹوں کی دیواروں، کھجور کی ٹہنیوں و پتوں کی چھت اور کمزور چھت کو سہارا دینے کے لیے کھجور کے تنوں کے ستونوں کی مسجد تھی، جس کا فرش کچا تھا، اور جو بارش میں کیچڑ سی بن جاتا، جس کی تکلیف وہی سے بچنے کے لیے بعد میں صحابہ نے باہر سے کنکریاں لاکر ڈال دی تھیں۔[1]

مولائے دوجہاں نے جو مسجد بنائی تھی، وہ آج کہاں، جس کی خاک مومنوں کی آنکھو

---

[1] سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۲۸۶

کا سرمہ بنے، آج جو عمارت اُس جگہ بنی ہے، وہ ترکوں کے زمانے کی ہے۔ مسجد کے صحن کے پار مُلحق مسجد کا جو حصّہ بلند و بالا ستونوں پر موری (مراکشی) طرزِ تعمیر پر بنایا گیا ہے، وہ موجودہ شاہی خاندان کے دوسرے بادشاہ سعود بن عبدالعزیز السعود کے عہد کا تعمیر کردہ ہے۔

اِسی مسجد کے پہلو میں اللہ کے نبیؐ نے اپنے قیام کے لیے جو گھر بنایا، وہ بھی اللہ کے گھر کی طرح کچی اینٹوں کا تھا، جس کی چھت، مسجد کی چھت کی طرح کھجور کی ٹہنیوں کی تھی، جس کے دروازے کے کواڑ نہ تھے بلکہ اُن کی جگہ کمبل کا پردہ تھا۔ حضرت حسن بصریؓ سے روایت ہے کہ "میں لڑکپن میں بلوغ سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں گیا ہوں، چھتیں اتنی نیچی تھیں کہ میں ہاتھ اٹھا کر اُن کو چھو سکتا تھا۔" امام بخاری نے تاریخ میں اور حافظ ابو یعلیٰ نے اپنی مسند میں لکھا ہے کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازوں کو انگلیوں کے ناخنوں سے ٹھونکا جاتا تھا، کیونکہ اُن میں کنڈیاں نہ تھیں۔" [1]

دورِ حاضر کے مسلمان درِ نبویؐ پر جب حاضری دیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ مسجدِ نبویؐ میں کھلتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دروازہ پورے کا پورا چاندی کی چادر سے منڈھا ہے اور قفل جو اُس پر پڑا ہے، وہ بھی چاندی ہی کا ہے اور درِ اقدس کا سنگِ آستاں بھی مرمر کا ہے، تو اُن میں سے بعض کو شاید یہ خیال گزرتا ہو کہ جس مکان کے کواڑ چاندی کے اور تھڑا مرمر کا ہے، وہ اندر سے کیسا عالی شان ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کے مختلف کمروں (حجروں) کی حقیقت تو بیان ہو چکی کہ اُن کی دیواریں کچی اینٹ اور چھتیں کھجور کی ٹہنیوں کی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کے مختلف کمروں میں سے جس کمرے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ رہا کرتی تھیں اور جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا، آج بھی اُسی حالت میں ایک پختہ چار دیواری کے اندر محفوظ ہے اور اُسی پر

---

[1] سیرتِ سرورِ عالم جلد دوم صفحہ ۷۴۸

گنبدِ خضرا بنا ہے، لیکن اُس چار دیواری میں کوئی دروازہ نہیں، جو کسی شخص کو اُس کمرے (حجرے) میں لے جائے، جہاں آپ مقیم رہے اور اب جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے بعد کے دو خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرت عمر فاروق رضؓ آرام فرما ہیں۔

تعمیرِ مسجد سے پہلے نماز باجماعت کا اہتمام نہ تھا، جس سے اسلام کی عبادتوں کا ایک مقصد یعنی وحدت و اجتماع فوت ہوتا تھا۔ تعمیرِ مسجد کے بعد باجماعت نماز قائم ہوئی اور اعلانِ نماز کے لیے حضرت عمر رضؓ کی رائے سے اذان کا طریقہ جاری ہوا"۔[1]

مکہ کے اکثر و بیشتر مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مدینہ منورہ پہنچ چکے تھے، اور مدینہ کے مسلمانوں کے مہمان کی حیثیت سے گزر بسر کر رہے تھے۔ "مہاجرین مکہ معظمہ سے بالکل بے سر و سامان آئے تھے، گو اُن میں دولت مند اور خوش حال بھی تھے، لیکن کافروں سے چھپ کر نکلے تھے، اس لیے کچھ ساتھ نہ لا سکے تھے، اگرچہ مہاجرین کے لیے انصار کا گھر مہمان خانۂ عام تھا، تاہم ایک مستقل انتظام کی ضرورت تھی۔ مہاجرین نذر اور خیرات پر بسر کرنا پسند نہیں کرتے تھے، وہ دستِ بازو سے کام لینے کے خوگر تھے، تاہم چونکہ نکھرے تھے اور ایک حبہ پاس نہ تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ انصار اور اُن میں رشتۂ اخوت قائم کر دیا جائے۔ جب مسجد قریب ختم ہوئی تو آپ نے انصار کو طلب فرمایا۔ حضرت انس رضؓ بن مالک جو اُس وقت دس سالہ تھے، اُن کے مکان میں لوگ جمع ہوئے، مہاجرین کی تعداد پینتالیس تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی طرف خطاب کر کے فرمایا "یہ تمہارے بھائی ہیں" پھر مہاجرین اور انصار میں سے دو دو اشخاص کو بلا کر فرماتے گئے کہ یہ اور تم بھائی بھائی ہو، اور اب وہ درحقیقت بھائی بھائی تھے انصار نے مہاجرین

---

[1] تاریخِ اسلام حصہ اوّل مولفہ شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۳۵

کو ساتھ لے جاکر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ دے دیا کہ آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے۔ سعدؓ بن الربیع جو عبدالرحمٰن بن عوف کے بھائی قرار پائے، اُن کی دو بیویاں تھیں، عبدالرحمٰن سے کہا کہ ایک کو میں طلاق دیتا ہوں، آپ اِس سے نکاح کر لیجئے، لیکن انہوں نے احسان مندی کے ساتھ انکار کر دیا۔ [1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی ہجرت کے بعد اسلامیانِ عالم پر کئی بار ایسی افتاد پڑی کہ اُنہیں گھر بار، مال و متاع چھوڑ کر دور و نزدیک کے اسلامی ممالک میں پناہ لینا پڑی۔ ماضی قریب کی مثالیں فلسطینی مسلمانوں کا ارضِ فلسطین، اور ہندی مسلمانوں کا ارضِ ہند سے خروج ہے، لیکن مسلمانوں کی ان دونوں ہجرتوں میں نہ تو لبنان، شام، عرب اور اُردن کے مسلمانوں نے اپنے گھر بار فلسطینیوں کے لیے وا کئے اور نہ ہی پاکستان میں بسنے والوں نے ہندی مسلمانوں کو اپنے گھروں میں جگہ دی۔ اس سے انکار نہیں کہ پاکستانی مسلمانوں نے ہندی مہاجرین کی دامے درمے خاصی مدد کی اور ہندی مہاجرین نے اپنی غیر منقولہ جائدادوں کے بدلے غیر مسلموں کے متروکہ مکان اور کاروبار حاصل کئے مگر اُن میں اور پاکستان میں بسنے والوں میں وہ مہر و محبت و اُخوّت پیدا نہ ہو سکی جو مکہ کے مہاجرین اور انصارِ مدینہ میں ہوئی۔ ۱۹۴۸ء میں فلسطین سے نکلے مہاجرین کی ایک نسل نے تو گویا اپنی پوری زندگی ہی لبنان، شام اور اُردن وغیرہ کے مہاجر کیمپوں میں گزار دی ہے۔ زمانۂ حال کی تازہ ترین مثال افغان مہاجرین کی ہے، جو پاکستان اور ایران میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ گو اُن کے طعام و قیام کا انتظام تو ہے مگر وہ اُخوّت و بھائی چارہ کہاں جو مکی مہاجرین اور مدنی انصار میں قائم ہوا تھا۔

ایک نہایت ہی قابلِ افسوس مثال بہاری مہاجرین کی ہے، جو ۱۹۴۷ء میں بہار (ہند) سے ہجرت کر کے مسلم اکثریت کے علاقے مشرقی پاکستان میں چلے

---

[1] سیرت النبی جلد اوّل ص ۲۹۰

آ سئے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان، جب بنگلہ دیش کے نام سے علیحدہ ہو کر خود مختار ہو گیا، تو وہی بہاری مسلمان اپنے ہی ملک میں ایک بار پھر مہاجر کی حیثیت اختیار کر گئے کیونکہ وہ بنگالی نہیں، بہاری مسلمان تھے۔ بنگلہ دیش انہیں اِس لیے اپنا شہری ماننے کو تیار نہ تھا کہ وہ بنگالی النسل نہ تھے اور نہ ہی پاکستان اُنہیں اپنا شہری تسلیم کرتے ہوئے اُن سب کی بنگلہ دیش سے پاکستان منتقلی کا انتظام کر پایا ہے، لہٰذا آج ۱۹۹۲ء میں اکیس برس بعد بھی وہ سب بہاری مسلمان جو پاکستان منتقل نہیں ہو سکے، کس مپرسی اور کشمکش کی حالت میں زندگی کے دن گزار رہے ہیں کہ کب پاکستان اُنہیں اپنا شہری تسلیم کرتے ہوئے، بنگلہ دیش سے اُن کے انخلاء کا انتظام کرتا ہے۔

بہاری مسلمانوں کا یہ المیہ، بنگلہ دیشی مسلمانوں کی اسلامی اُخوت سے روگردانی کا نتیجہ ہے۔ صد افسوس کہ مسلمان آج عربی، ایرانی، بنگلہ دیشی اور پاکستانی پہلے ہے اور اُمتِ مسلمہ کا رکن بعد میں، اور یہی بات اُمتِ مُسلمہ کی یک جہتی، اُخوت اور اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، اور یہی وہ رکاوٹ ہے، جسے دورِ حاضر میں اُمتِ مُسلمہ میں منافقت کا نام دیا جا سکتا ہے، جو بلا شبہ اُمتِ مُسلمہ کا سب سے کمزور پہلو ہے، اور جس سے اسلام دشمن حکومتوں اور قوتوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ بنگلہ دیش کا وجود ہی اسلام دشمن قوتوں کا اسلام پر ضرب شدید کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

دینِ اسلام کے شناسا آج اگر یہ پکارتے ہیں کہ دینِ اسلام ایک مکمل ضابطہء حیات اور بنی نوعِ انسان کے لیے راہِ نجات ہے تو سب سے پہلے مغرب زدہ مسلمان ہی اُن کا تمسخر یہ کہہ کر اُڑاتے ہیں کہ "چودہ برس کے پرانے آئین میں دورِ حاضر کی ضروریات اور تقاضوں پر پورا اُترنے کی صلاحیت کیونکر ممکن ہے؟"

گزشتہ چودہ سو برس میں کفار اور نصاریٰ نے مسلمانوں کو کئی ممالک سے نکالا۔ نصاریٰ نے مسلمانوں کو ہسپانیہ سے نکالا تو چنگیز و ہلاکو کے حملوں سے تباہ و برباد ہو کر مسلمان روسی ترکستان، ازبکستان، افغانستان، ایران و عراق وغیرہ سے نکلے۔

صلیبی جنگوں میں نصاریٰ نے مسلمانوں کو ارضِ شام و فلسطین سے نکالا، یہود نے ۱۹۴۸ء میں مسلمانوں کو ارضِ فلسطین سے نکال باہر کیا، اور ۱۹۴۷ء میں سکھوں اور ہندوؤں نے دہلی سے امرتسر تک کے مسلمانوں کے خون سے ایسی خوفناک ہولی کھیلی جس کی مثال صرف چنگیز و ہلاکو کے دور ہی میں ملتی ہے، اور آج روس کے دہریوں نے افغان مسلمانوں پر اُن کی اپنی ہی سرزمین کو تنگ کر دیا ہے۔

اسلام کے مکمل ضابطۂ حیات و راہ تجارت ہونے میں کیا اب بھی کوئی شک ہے کہ اُس نے صدیوں بعد بار بار پیش آنے والی بلاہائے عظیم کا حل مسلمانوں کو ۱ھ میں ہی بتا دیا، نہ صرف بتایا ہی بلکہ اُس کے نبی اکمل ؐ نے اُس کا حل بھی پیش کر دیا تھا۔ مسلمان آج اگر آئینِ مسلمانی پر عمل پیرا نہ ہو کر اور انسانِ کامل ؐ کی راہ پر نہ چل کر ذلیل و خوار ہوتا ہے تو اس میں آئینِ اسلامی کا نہیں، دورِ حاضر کے مسلمان کی حرص و ہوس، خود غرضی و نفسا نفسی کا قصور ہے۔

اِدھر انصارِ مدینہ کا یہ ایثار کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر لبیک کہتے ہوئے مہاجرینِ مکہ کو اپنے اَثاثُ البیت، باغات اور کھیتوں کھلیانوں تک میں برابر کا حصہ دار تسلیم کر لیا، اُدھر مہاجرینِ مکہ کی عزتِ نفس اور اپنے دست و بازو کی کمائی پر بھروسے کا یہ عالم کہ انصار بھائیوں سے تھوڑی بہت مالی امداد قبول کر کے تجارت پیشہ ہونے کی بنا پر مدینہ کے بازار کی راہ لی۔

حضرت عبدالرحمٰن ؓ بن عوف نے حضرت سعدؓ بن الربیع کا نصف اَثاثُ البیت لینے کی بجائے قینقاع کے مشہور بازار کی راہ لی، اور وہیں سے تھوڑا سا گھی اور پنیر خرید کر کاروبار شروع کر دیا اور تھوڑے سے ہی عرصہ میں اِس قدر کما لیا کہ شادی کر لی اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اُن کا مال و اسبابِ تجارت سات سات سو اونٹوں پر لد کر آتا تھا۔

حضرت ابوبکر ؓ مکہ میں کپڑے کی تجارت کرتے تھے، سو انہوں نے مدینہ میں کپڑے کا کاروبار شروع کر دیا۔ حضرت عثمان ؓ قینقاع کے بازار میں کھجور کی خرید و فروخت کرنے لگے اور حضرت عمر ؓ بھی کاروبار میں لگ گئے۔ غرض یہ کہ اِسی طرح بہت سے صحابہ کرام

اپنی اپنی حیثیت اور سوجھ بوجھ کے مطابق تجارت میں لگ گئے۔

مہاجرین میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو اہل و عیال کے بندھن سے آزاد تھے، اُنہوں نے تجارت و زراعت وغیرہ کی بجائے اپنا سارا وقت قرآن کی تعلیم کے حصول اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت کے لیے وقف کر دیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اصحابِ صفّہ کہلائے اور بعد کے زمانے میں، اِن ہی کی پیروی میں صوفیاء کا گروہ سعید وجود میں آیا، جس نے سندھ و ہند کے کفرستان میں نورِ اسلام کو پھیلایا۔

اصحابِ صفّہ کا گزارا یوں تھا کہ اِن میں سے کچھ دن میں، مدینہ کے گرد و نواح سے لکڑیاں وغیرہ کاٹ اور چن لایا کرتے تھے اور انہیں بیچ کر اپنے حلقے کے لوگوں کے لیے کھانا خرید لاتے تھے۔ کبھی صدقے میں کچھ آتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُنہیں بھجوا دیتے اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے کا نذرانہ آتا تو اُنہیں اپنے ساتھ کھانے میں شامل کر لیتے، اور اکثر ایسا ہوتا کہ رات کے کھانے کے لیے اصحابِ صفّہ کو مہاجرین و انصار میں تقسیم کر دیتے۔ ہر صحابی اپنی استطاعت کے مطابق اُن میں سے کچھ کو ساتھ لے جاتا۔ چونکہ یہ حضرات قرآن سے پوری طرح واقف اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ عالیہ کثرت سے سنتے رہتے تھے، اِس لیے دعوتِ اسلامی کے لیے جب بھی اصحابہ میں سے کسی کو بھیجنے کی ضرورت پیش آتی تو اُن ہی میں سے انتخاب کیا جاتا تھا۔

یہ حضرات مسجدِ نبوی سے ملحق ایک چبوترے پر مقیم تھے، جس پر سائبان ڈال دیا گیا تھا۔ آج بھی یہ صفّہ موجود ہے مگر مسجدِ نبوی کے اندر آ گیا اور مسجد ہی کی طرح خوبصورت بنا ہوا ہے اور اُس پر بھی مسجد کی طرح قالین بچھے ہیں۔ اب اِس چبوترے پر خدامِ مسجد خصوصاً قوی الجسم حبشی النسل وہ خدّام بیٹھے رہتے ہیں، جو اپنا رشتہ حضرت بلال حبشیؓ سے ملاتے ہیں۔

صفر ۴ھ میں بنی کلاب کے سردار ابو براء نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ میری قوم میں تبلیغِ اسلام کے لیے کچھ آدمی بھیج دیجیے۔ آپؐ نے ستّر آدمی ساتھ کر دیئے۔ انہوں نے راستے میں بیر معونہ میں قیام کیا اور حرام بن ملحان کو

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خط دے کر قبیلہ کے رئیس عامر بن طفیل کے پاس بھیجا، جس نے اُن کو قتل کر دیا، اور عصینہ، رعل اور ذکوان کے قبائل کو لے کر مسلمانوں کی طرف بڑھا۔ اِدھر مسلمان حرامؓ کی واپسی کا انتظار کر کے ان کی تلاش میں نکل پڑے، آگے بڑھ کر عامر کا مقابلہ ہوا، اُس نے گھیر کر مسلمانوں کو قتل کر دیا، صرف عمرو بن امیہ کو چھوڑ دیا۔ حضورؐ کو اس واقعہ کی خبر سے سخت صدمہ ہوا[1]

یہ اُنہتر ۶۹ جو شہید ہوئے، بقول شبلی نعمانی سب کے سب اصحابِ صفّہ ہی تھے۔[2]

بہر طور یہ وہ حضراتِ صدق وصفا اور فقر وفاقہ تھے، جنہوں نے اپنی زندگیاں قرآن وسنت کے حصول کے لیے وقف کر رکھی تھیں اور یہی وہ گروہِ عاشقانِ رسولؐ تھا، جو ہمہ وقت دیدارِ یار سے مسرور وشادکام ہوتا تھا اور ان ہی میں سے حضرت ابوہریرہؓ ہیں، جن سے ایک کثیر تعداد احادیث کی روایت ہے۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ "حضرت ابوہریرہؓ پر لوگوں نے کثرتِ روایت کی بنا پر اعتراض کیا کہ اور صحابہ تو اِس قدر روایت نہیں کرتے، تو انہوں نے کہا "اِس میں میرا کیا قصور ہے، اور لوگ بازار میں تجارت کرتے تھے اور میں رات دن بارگاہِ نبوت میں حاضر رہتا تھا"۔[3]

اُمّتِ مُسلمہ پر اصحابِ صفّہ اور خصوصاً حضرت ابوہریرہؓ کا احسانِ عظیم ہے کہ اِس قدر عظیم ذخیرہ احادیث کا مسلمانوں کے ہاتھ لگا ہے، جو اسلام کو سمجھنے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کو جاننے میں اُن کی مدد کرتا ہے۔ یہ عاشقانِ رسولؐ اگر نہ ہوتے تو احادیث کے ایک بہت بڑے حصے سے اُمّتِ مُسلمہ محروم رہ

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اوّل ص ۴۹

[2] سیرت النبی جلد اوّل ص ۲۹۹

[3] سیرت النبی جلد اوّل ص ۲۹۳

جاتی۔ حضرت ابوہریرہؓ پر نہ صرف اُن کی حیاتِ مبارکہ ہی میں اُن کی کثرتِ روایت پر اعتراض ہُوا۔ بلکہ آج بھی منکرینِ حدیث اُن کی اِسی کثرتِ روایت کی آڑ لیتے ہیں، جس کا جواب وہی ہے، جو شمعِ رسالت کے پروانے نے اپنی زندگی میں دیا تھا، اور جس کا جواب منکرینِ حدیث کے پاس ہے ہی نہیں۔

اصحابِ صفّہ ہی ہیں، جن کے تتبعُ میں طبقۂ صوفیاء وجود میں آیا، اور اِسی طبقۂ صدق وصفا میں سے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جناب سری سقطیؒ، جناب جنید بغدادیؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، حضرت علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش لاہوریؒ، شیخ معین الدین چشتی اجمیریؒ، حضرت بابافرید گنج شکرؒ، شیخ زکریا ملتانیؒ، شیخ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت علی احمد صابرؒ، حضرت میاں میر صاحب لاہوریؒ وغیرہم سے جلیل القدر صوفیاءِ کرام پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اسلام کی تبلیغ واشاعت نہ صرف مشرقِ وسطیٰ میں کی، بلکہ حضرت علی ہجویری سے حضرت علی احمد صابرؒ تک نے کفرستانِ ہند میں اسلام کے پھیلانے میں وہی کام کیا۔ جو حضورؐ کی بعثت سے قبل بنی اسرائیل کے پیغمبر سرزمینِ عرب وشام وفلسطین میں کرتے آئے تھے۔ ہند وپاکستان وبنگلہ دیش کے اکثر وبیشتر مسلمانوں کے آباؤ اجداد اِن ہی اولیائے عظام کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئے، گویا بت کدۂ ہندوستان میں نورِ اسلام پھیلانے والے صوفیائے عظام، اصحابِ صفّہ ہی کی روحانی اولاد میں، جن کا روحانی فیض اب بھی جاری وساری ہے، اور اِسی فیض کا نتیجہ ہے کہ ماضی قریب میں پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ، پیر جماعت علی شاہ علی پوریؒ، اور میاں شیر محمد صاحب شرقپوریؒ سے مُرشدِ کامل گزرے ہیں، جنہوں نے غلط عقائد میں مبتلا مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کو راہِ راست پر ڈالا، اللہ اور اُس کے رسولؐ کی مہر ومحبت کی شمع کو اُن کے دلوں میں روشن تر کیا۔

قرآن کے بیان کردہ حقائق کی روشنی میں اگر جائزہ لیا جائے، تو یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ حضرت نوحؑ اور صالح علیہم السلام اعلائے کلمۃ الحق میں اپنی زندگیاں گزار

کہ بھی کُفّار و مشرکین کی ایک نہایت ہی قلیل تعداد کو توحید کا پیروکار بنا سکے، لیکن برعکس اِس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتیوں اور اصحابِ صفّہ کی روحانی اولاد میں سے بعض صوفیاء و اولیاء نے مشرق وسطیٰ و ہند میں اتنی بڑی تعداد میں کُفّار و مشرکین کو مشرف بہ اسلام کیا کہ اُن کی تعداد سینکڑوں و ہزاروں نہیں، لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ حضرت نوحؑ کی طویل ترین تبلیغ کا ثمرہ ایک قلیل تعداد اُن توحید پرستوں کی تھی، جو اُن کی بنائی ہوئی کشتی میں درندوں، چرندوں اور پرندوں کے ساتھ ہی سوار ہو گئے تھے۔ حضرت لوطؑ بحکمِ ربی سدوم کو چھوڑ کر جب نکلے تو چند ہی لوگ اُن کے ساتھی تھے، اور ایسی ہی مختصر تعداد حضرت صالحؑ کے پیروکاروں کی تھی، جب مدائن کی بربادی سے ذرا پہلے اُنہوں نے وطن چھوڑا تھا۔

اِن حقائق کے بیان کرنے سے نہ تو انبیائے علیہم السلام کی عظمت کی تنقیص مقصود ہے اور نہ اولیائے اسلام کے کارناموں کی مبالغہ آمیز تحسین، اور نہ ہی انبیائے قدیم اور اولیائے عہدِ جدید کا کسی قسم کا موازنہ ہے، بلکہ یہ مختصر بات کہنا مقصود ہے کہ اُس نبی اکملؐ کی شان کتنی ارفع و اعلیٰ ہے، جس کے تربیت یافتہ اصحابِ صفّہ کی روحانی اولاد نے صدیوں بعد بھی انبیائے بنی اسرائیل کی طرح صرف قبیلوں، گاؤں اور شہروں ہی کو نہیں بلکہ پوری پوری قوموں اور پورے پورے ممالک کو کفر کے اندھیاروں سے نکال باہر کیا اور اُنہیں اُس شاہ راہِ نور پر ڈال دیا، جس کا منبع و سرچشمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے، اور اُسی ذاتِ گرامی کی اُمّت کے اکابر و صلحاء اِس مسئلے پر متفق ہیں کہ کوئی ولی کسی صحابی کے درجے کو، اور کوئی صحابی کسی نبی کے رتبے کو نہیں پہنچتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی نجی اور دینی ضروریات کے ساتھ ساتھ مدینے میں بسنے والے دیگر مذاہب و قبائل کے لوگوں خصوصاً یہود سے جو مدینے میں فریقِ غالب کی حیثیت رکھتے تھے، ایک معاہدہ کیا، جس کی چیدہ چیدہ شرائط پر ایک نظر ڈال لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے بڑے مقاصد اِس معاہدے سے کیا تھے۔

(۱) خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا ہے، وہ قائم رہے گا۔
(۲) یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور اُن کے مذہبی اُمور سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔
(۳) یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔
(۴) فریقین میں سے جب کسی کو تیسرے فریق سے جنگ پیش آئے، تو وہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار رہیں گے۔
(۵) کوئی فریق قریش کو امان نہ دے گا۔
(۶) جب کوئی بیرونی طاقت یثرب (مدینہ) پر حملہ کرے گی، تو دونوں مل کر مدافعت کریں گے۔
(۷) فریقین میں سے جب کوئی تیسری طاقت سے صلح کرے گا تو دوسرے کو بھی صلح کرنی ہوگی، البتہ مذہبی لڑائیاں اِس سے مستثنیٰ رہیں گی۔
(۸) مظلوم کی مدد و نصرت کی جائے گی۔
(۹) یثرب (مدینہ) کے اندر کشت و خون کرنا، اِس معاہدہ کرنے والی سب قوموں پر حرام ہوگا۔
(۱۰) اِس معاہدہ کی قوموں کے اندر اگر کوئی ایسی نئی بات یا جھگڑا پیدا ہو جائے، جس میں فساد کا خوف ہو، تو اس کا فیصلہ خدا اور محمد رسول اللہ کے متعلق سمجھا جائے گا۔[1]

اِس معاہدے کی شرائط سے یہ بات بالکل واضح ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اولین مقصد یثرب (مدینہ) میں امن و امان قائم رکھنا تھا۔ یہود کو ہر قسم کی مذہبی آزادی کا حق دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کو بھی اِس بات کا پابند کیا گیا تھا کہ یہود سے دوستانہ برتاؤ کریں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس معاہدے سے جو فوائد حاصل کرنا چاہے، وہ

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اوّل ص ۲۶۔۲۷، سیرۃ النبی جلد اوّل ص ۳۰۲ اور رحمۃ للعالمین حصہ اوّل ص ۱۰۱

یہ تھے کہ قریش کو امان نہ دی جائے۔ ظاہر ہے کہ مسلمان تو دشمنانِ اسلام کو امان دینے سے رہے، جو اُن کی جان کے دشمن تھے، سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ اُن کے دشمنوں کو کوئی دوسرا فریق یثرب میں پناہ نہ دے۔ جہاں تک یثرب (مدینہ) کے دفاع کا معاملہ تھا، یہ اِس میں بسنے والے سارے قبائل واقوام کا مشترکہ مسئلہ تھا، اِس لیے حضورؐ یہ چاہتے تھے کہ سبھی اِس میں شریک ہوں۔

یہ تھا یثرب (مدینہ) میں ہجرت کا پہلا سال اور اِس برس چونکہ مسلمانوں کو کفّارِ مکہ سے قدم قدم پر جو دھڑکا اور خوف لگا رہتا تھا، اُس سے نجات مل گئی تھی، اِس لیے ظہر، عصر اور عشاء کی نمازوں میں چار چار رکعتیں فرض ہو گئیں۔

۲ھ تاریخِ اسلام میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس برس تحویلِ قبلہ ہوئی اور اِسی میں معرکۂ بدر پیش آیا۔ مسلمان شعبان ۲ھ تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔ آپؐ کی دلی خواہش یہ تھی کہ بارگاہِ خداوندی سے تحویلِ قبلہ کا حکم مل جائے، جس پر قرآن نے یوں شہادت دی ہے، اور حضورؐ کی یہ خواہش اللہ نے پوری کی کہ شعبان ۲ھ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

> "یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ لو ہم اُسی قبلے کی طرف تمہیں پھیر دیتے ہیں، جسے تم پسند کرتے ہو۔ مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں تم ہو، اُسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔ (سورۃ البقرۃ)

یہی وہ دن ہے کہ جب اُمّتِ مُسلمہ اور یہود و نصاریٰ کے درمیان ایک خطِ امتیاز کھینچ دیا گیا۔ اُنہیں ایک مرکز دے کر گویا یہ بتا دیا گیا کہ یہ ایک ایسی اُمّت ابھری ہے، جو صحیح معنوں میں ملّتِ ابراہیمی کہلائے گی۔ حضرت ابراہیمؑ کی سنت کی تجدید کرتے ہوئے اُن کے بنا کردہ کعبہ کا طواف کرے گی۔ اُن کی زوجہ محترمہ حضرت ہاجرہؓ کے نقشِ قدم پر دوڑ کر صفا و مروہ کی سعی کرے گی اور اُن کے فرزندِ ارجمند حضرت اسماعیلؑ

کی فرماں برداری وسعادت مندی کی یاد میں قربانی کرے گی، اور اُن کے قول وفعل کی مطابقت میں اُن کے بنا کردہ کعبہ سے کفر وشرک کی ایک ایک علامت کو مٹا کر توحید کو خالص کر دے گی اور یہیں سے توحید چار دانگ عالم میں پھیل جائے گی۔

وہ یہودی جو منافقانہ مسلمانوں کی صفوں میں گھسے ہوئے تھے اور مسلمان کہلاتے تھے، لیکن درحقیقت تھے یہودی ہی، چھٹ کر الگ ہو گئے، کیونکہ اُن کے قبلے سے مسلمانوں نے منہ پھیر لیا تھا۔

۱۹۶۹ء تک مدینہ منورہ کے نواح میں مسجدِ قبلتین میں، دونوں قبلوں کے رخ کی محرابیں موجود تھیں یعنی بیت المقدس کے رخ والی اور کعبہ کے رخ والی بھی مگر ۱۹۷۲ء میں بیت المقدس کے رخ والی محراب کو سعودی حکومت نے اینٹوں سے چنوا دیا تھا۔

روایت ہے کہ یہی وہ جگہ تھی، جہاں تحویلِ کی آیت اُتری، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی جگہ نماز ہی کی حالت میں اپنا رخِ زیبا کعبہ کی طرف پھیر لیا تھا۔

۲ھ کا سب سے بڑا واقعہ معرکۂ بدر ہے، جس نے اسلامی تاریخ کا دھارا ہی بدل دیا۔ دیگر مذاہب کے مؤرخین خصوصاً یورپ کے عیسائی انگشت بدندان ہیں کہ مسلمانوں کو فتح کیونکر نصیب ہوئی، جس کی بہت سی الٹی سیدھی تاویلیں بھی کرتے ہیں، لیکن اسلامی تاریخ کے اِس اہم ترین واقعہ کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتے۔

معرکۂ بدر کی رُوداد اسلامی تاریخ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی ہر کتاب کا جزوِ اعظم ہے۔ اِس کے بیان کرنے میں نہ صرف غیر مذاہب کے بلکہ خود مسلمان مؤرخین اور سیرت نگاروں کے اقلام نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ماضی قریب میں لکھی گئی سیرت کی کتابوں میں سیرت النبی، ایسی کتاب ہے، جس میں اِس معرکہ پر محققانہ بحث کی گئی ہے اور معرکۂ بدر کے ہر ہر پہلو کا جائزہ لیا گیا ہے جو قریباً ترپن صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔"[۱]

---

[۱] سیرت النبی جلد اوّل ص ۳۲۱ تا ص ۳۷۳

اِس کے برعکس رحمۃٌ للعالمین کے مؤلف نے معرکۂ بدر کا تذکرہ صرف ایک ہی صفحہ پر کیا ہے۔[1]

تاریخ اسلام کے مؤلف نے غزوۂ بدر کو ڈھائی صفحات میں سمیٹ لیا ہے۔[2]

اور تاریخ الامت کے مؤلف علامہ اسلم جیراجپوری نے دس صفحات پر اِس معرکۂ حق و باطل کا ذکر کیا ہے۔[3]

ہمارا موضوع تاریخ نہیں، سیرت ہے، اور وہ بھی مختصر، اِس لیے ہمارا مرکزِ نگاہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔ طغیانِ کفر و ضلالت مکہ سے مدینہ کی جانب اِس لیے بڑھا تھا کہ مدینہ میں پناہ گزین مسلمانوں (جن میں آقائے نامدار بھی تھے) کو نیست و نابود کر دے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس معرکۂ حق و باطل میں کیا کردار ادا کیا۔ اُنہوں نے بحیثیت نبی کیا روش اختیار کی اور بحیثیت سالارِ دستہ، ۳۱۳ کے مختصر پیادہ دستے کو میدانِ بدر میں کس طرح لڑایا، اُسے کیا ہدایات دیں، اور بطور فاتح اپنے دشمن سے کیا سلوک کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے صاف بچ نکلنے پر، قریشِ مکہ انتہائی پیچ و تاب میں تھے۔ انہوں نے چند ہی دن بعد انصارِ مدینہ کے سردار عبداللہ بن اُبی کو لکھا کہ "تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ ہم اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم اُن کو قتل کر ڈالو، یا (مدینہ سے) نکال دو، ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کریں گے اور تم کو فنا کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کریں گے۔"[4]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے اِس خط کا اثر یوں زائل کیا کہ اِس خبر کے ملنے

---

[1] رحمۃٌ للعالمین حصہ اوّل ص ۱۰۶

[2] تاریخ اسلام حصہ اوّل ص ۱۴۲ تا ۱۴۴

[3] تاریخ الامت جلد اوّل ص ۱۱۵ تا ص ۱۲۴

[4] سیرت النبی جلد اوّل ص ۳۱۲-۳۱۱

پھر عبداللہ بن اُبیّ سے خود ملے اور کہا کہ "کیا تم اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے"؟ کیونکہ انصار مدینہ میں سے اکثر مسلمان ہو چکے تھے۔ عبداللہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات کو پا گیا اور قریش کا یہ حربہ کارگر ثابت نہ ہوا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم، قریشِ مکہ کے کینہ و بغض، اُن کی مالی و جنگی طاقت سے خوب واقف تھے۔ اِدھر مہاجرین اور انصار کی کمزور مالی حالت اور جنگی صلاحیت کو بھی جانتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی حالت نسائی اور حاکم نے یوں بیان کی ہے۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں آئے تو راتوں کو جاگا کرتے تھے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور صحابہ جب مدینہ آئے اور انصار نے اُن کو پناہ دی تو تمام عرب ایک ساتھ اُن سے لڑنے کو آمادہ ہو گئے، صحابہ صبح تک ہتھیار باندھ کر سوتے تھے۔[1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حالات میں انصارِ مدینہ اور مہاجرین کے جان و مال کی حفاظت کے لیے یہ کیا کہ مدینہ کے قرب و جوار کے قبائل سے امن و امان کے معاہدے کئے، جن میں جُہنیہ کا قبیلہ ہے، جو مدینہ سے تین منزل پر آباد تھا، اور بنو حمزہ، جو آٹھ منزل (تقریباً ۸۰ میل) پر، اور بنو مدلج سے جو ینبوع کے نواح میں میں آباد تھے۔ دوسری تدبیر آپؐ نے یہ سوچی کہ قریش کی ملک شام سے تجارت میں خلل ڈال دی جائے، جو اُن کا سب سے بڑا ذریعہ معاش ہے، تاکہ قریش، مسلمانوں سے صلح کرنے پر مجبور ہو جائیں، اور اِس طرح مدینہ کے انصار و مہاجر، امن و امان سے زندگی بسر کر سکیں۔

قریش، کسی طور بھی، مہاجرینِ مکہ اور انصارِ مدینہ سے دبنے والے نہ تھے، اِسے قریش مکہ کی تجارت میں خلل اندازی کا جواب کہیے یا قریشِ مکہ کا مظاہرہ طاقت کہ ربیع الاوّل ۲ھ میں کُرز بن جابر فہری نے جو مکہ کے ایک قبیلہ کا سردار تھا، مدینہ سے

---

[1] سیرت النبی جلد اوّل ص ۳۱۴

متصل چراگاہ پر حملہ کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مویشی لوٹ کر لے گیا، اور تعاقب کے باوجود ہاتھ نہ آیا۔

رجب ۲ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن جحش کو آٹھ[1] یا بارہ[2] آدمیوں کے ساتھ ایک خط دے کر مکہ کی طرف روانہ کیا اور کہا کہ "اسے دو روز کی مسافت کے بعد کھولنا"۔ مقررہ مسافت طے کرنے کے بعد خط جب کھولا گیا تو اس میں یہ ہدایت درج تھی کہ "مقام نخلہ میں قیام کرو اور قریش کے حالات کا پتہ لگاؤ اور اطلاع دو"۔ اسی قیام کے دوران میں عمرو بن حضرمی جو قریش مکہ کا حلیف تھا، تین ساتھیوں کے ہمراہ تجارتی مال کے چند اونٹ لیے اُدھر سے نکلا، عبداللہ بن جحش اور اُس کے ساتھیوں نے اُن پر حملہ کیا، جس سے عمرو بن حضرمی مارا گیا، ایک بھاگ گیا اور اُس کے دو ساتھی پکڑے گئے۔ مدینہ پہنچ کر حضرت عبداللہ بن جحش نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سارا واقعہ بیان کیا اور پکڑا ہوا مال واسباب پیش کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "میں نے تم کو یہ اجازت نہیں دی تھی" اور مال کے قبول کرنے سے انکار کر دیا، چونکہ یہ واقعہ ماہ رجب میں ہوا تھا، جس میں لڑائی حرام ہے، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ، حضرت عبداللہ سے برہم ہوئے۔ قرآن نے اس واقعہ کی خبر اور اس پر فیصلہ یوں دیا ہے۔

> "لوگ آپ سے ماہ حرام میں لڑائی کی نسبت پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ اس میں لڑنا بڑا گناہ ہے، اور اللہ کے راستے سے روکنا، اس پر ایمان نہ لانا اور مسجد الحرام میں نہ جانے دینا، وہاں کے باشندوں کو نکال دینا، اللہ کے نزدیک اس سے بڑھ کر ہے اور فتنہ، خونریزی سے سخت تر ہے۔ یہ کافر برابر تم سے لڑتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ ان کا بس چلے تو تم کو تمہارے دین سے برگشتہ کر دیں"۔ (۲/۲۱۷)

---

[1] تاریخ الامت جلد اوّل ص ۱۱۲

[2] سیرت النبی جلد اوّل ص ۳۱۹

اللہ تعالیٰ نے جب کُفّار کی غلطیوں کو حضرت عبداللہ رضؓ کی غلطی سے بڑھ کر بتایا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تردُّد رفع ہوگیا، لیکن اِس واقعہ سے قریش مکہ مشتعل ہوگئے، اور انتقام لینے پر تُل گئے۔ حضرت عروہؓ بن زبیر جو حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے، اُن کی رائے میں معرکۂ بدر عمرو بن حضرمی ہی کے قتل کا نتیجہ تھا۔

قریش مکہ، مدینہ پر حملے کی تیاریوں میں تھے۔ اِس معرکے کے مصارف سے نمٹنے کے لیے مکہ سے ضروری مالِ تجارت لے کر ایک بڑا قافلہ ابوسفیان کی قیادت میں شام روانہ ہوچکا ہُوا تھا۔ اب کے اِس قافلۂ تجارت میں مکہ کے سبھی کُفّار کا مال لگا ہُوا تھا تاکہ منافع اِس قدر ہو کہ جنگ کی تیاری بڑے پیمانے پر ہو سکے۔ اُن ہی دنوں حضورؐ نے مکہ والوں کی گُن سُن لینے کو حضرت عبداللہؓ بن جحش کی قیادت میں آٹھ یا بارہ آدمیوں کا جو مختصر سا دستہ مکہ کے قریب مقامِ نخلہ روانہ کیا تھا، جس نے عمرو بن حضرمی کو قتل کر دیا، اور اُس کا سامان لوٹ کر مدینہ لے آئے، جس سے افواہ پھیل گئی کہ مسلمان اب اُس بڑے قافلے کو بھی لوٹنے کی تیاری میں ہیں، جس میں مکہ کے ہر صاحبِ استطاعت کا مال لگا ہُوا ہے، اُدھر ابوسفیان کے جاسوسوں نے راستہ ہی میں اُسے یہ اطلاع پہنچائی کہ مدینہ کے مسلمان قافلے کو لوٹنے کی تیاری میں ہیں۔ اُس نے فوراً ایک تیز رو قاصد اِس پیغام کے ساتھ مکہ روانہ کر دیا "قافلے کی مدد کو پہنچو، ورنہ مسلمان سب کچھ لوٹ لیں گے"۔

ابوسفیان راستوں کے پیچ وخم سے خوب واقف تھا، سو وہ اپنے تجارتی قافلے کو عام راستے سے ہٹا کر بحیرۂ احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلاتا ہُوا نکال کر لے گیا، اور اُس کی اطلاع ابوجہل کو کروادی، جو سب سے بڑا مخالفِ اسلام تھا، مگر وہ کہاں ماننے والا تھا۔

اِدھر قریش مکہ سے نکلنے کی خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پہنچ چکی تھی، لہٰذا انھوں نے مہاجرین و انصار سے اِس معاملے میں مشورہ کیا تو مہاجرین کے ساتھ ساتھ اکثر و بیشتر انصار کو بھی مستعد پایا، چنانچہ تین سو تیرہ (۳۱۳) یا تین سو چودہ (۳۱۴) صحابہ[1]، جن میں

---

[1] سیرت النبی جلد اوّل ص ۳۲۳

ساٹھ[1] مہاجر[2] اور باقی انصار یا تراسی مہاجر اور باقی انصار تھے[3] ۱۲ رمضان یا ۹ رمضان[4] ۲ھ[5] کو مدینے سے نکلے۔ مہاجرین و انصار مسلمانوں کی حالت ملاحظہ ہو کہ اُن کے پاس صرف دو[6] گھوڑے اور ساٹھ اونٹ تھے اور باقی پیدل، جب کہ قریشِ مکہ کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی، جن میں سو کے قریب گھڑسوار تھے۔ مسلمانوں کے پاس ہتھیار بھی پورے نہ تھے، جب کہ قریش کا ہر لڑنے والا پوری طرح سامانِ حرب سے لیس[7] تھا۔

اُدھر کفّار اور مومنین ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہیں، اور اِدھر اللہ کے رسولؐ کی حالت یہ ہے کہ اپنے رب کے حضور ہاتھ پھیلائے عرض کر رہے ہیں۔

"خدایا! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے، آج پورا کر۔"

آقائے دو جہاںؐ محویت اور بے خودی کے اِس عالم میں ہیں کہ چادر کندھے پر سے گر گر پڑتی ہے اور خبر تک نہیں ہوتی، اُسی حالت میں سجدے میں گرتے اور عرض کرتے ہیں۔

"خدایا! اگر یہ چند نفوس آج مٹ گئے، تو پھر قیامت تک تو نہ پوجا جائے گا۔"

بدر کی اِس لڑائی میں ایسے ایسے واقعات دیکھنے میں آئے، جو دنیا کی کسی بھی دوسری لڑائی یا جنگ میں دیکھنے میں نہیں آتے، تو ہیں، غیر قوموں سے، ایک مذہب کے پیروکار

۱ھ تاریخ الاُمت جلد اوّل ص ۱۱۷

۲ھ سیرت النبی جلد اوّل ص ۳۲۳

۳ھ تاریخ الاُمت جلد اوّل ص ۱۱۷

۴ھ سیرت النبی جلد اوّل ص ۳۲۳

۵ھ تاریخ الاُمت جلد اوّل ص ۱۱۷

۶ھ رحمۃ للعالمین جلد اوّل ص ۱۰۵

دوسرے مذہب کے پیروکاروں سے لڑتے آئے ہیں، لیکن یہ شاذ و نادر ہے کہ ایک ہی شہر کے باشندے اور وہ بھی باپ بیٹا، سسر داماد، چچا بھتیجا، ماموں بھانجا، ایک دوسرے کے مقابل ہوئے ہوں۔ شاید یہ ایک سبب بھی ہے کہ اسلام میں بدر والوں کا رتبہ سب سے بڑا ہے۔ آقائے نامدارؐ کے لاکھوں صحابہؓ ہزاروں اولیاء اور کروڑوں اُمتیوں میں سے کوئی بھی اُن کے مقام کو نہیں پہنچتا۔

یہی وہ معرکہ حق و باطل ہے، جس نے ثابت کر دیا کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ سے محبت کرنے والوں کے سامنے اللہ و رسولؐ کے دشمن نہ اُن کے بیٹے ہیں نہ بھائی، نہ داماد ہیں نہ بھتیجے و بھانجے، دین کے رشتے کے سامنے ہر رشتہ فروتر اور ہیچ ہے۔

یہی وہ میدانِ حرب ہے، جس میں حضرت حذیفہؓ کی تلوار اپنے باپ عتبہ کے خلاف میان سے نکلی، تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کے خلاف تلوار اُٹھائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا داماد ابوالعاص اپنے سسر و نبی کے خلاف میدانِ جنگ میں اُتر آیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے چچا عباس اپنے نبی بھتیجے کے خلاف صف آراء ہوئے اور حضرت عمر فاروقؓ کی تلوار اپنے ہی ماموں کے سر پہ چمکی ہے۔

یہی وہ مقدس میدانِ قتال ہے، جہاں ضعیف مومنین کے لیے اُسی قدر فرشتے مددگار ہوئے جس قدر کہ کفّار کا لشکر تھا یہی وہ عزّ و شرف والی سرزمین ہے کہ جہاں اللہ کے ہاتھ نے نبیؐ کا ہاتھ بن کر لشکرِ کفّار پر کنکریاں برسائیں اور یہی وہ مقتل ہے، جس میں قتل کئے گئے کفّار کا قاتل، اللہ نے خود کو ٹھہرایا، اور یہاں کفّار کے مقابلے میں پیٹھ پھیرنے والے جہنمی ٹھہرے، اور ان سب حقائق و شواہد کو وحی کے ذریعے سورۂ انفال کی شکل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا، تاکہ مسلمانوں کی آنے والی نسلیں ان حقائق سے متعلق کبھی بھی شک و شبہ میں مبتلا نہ ہوں۔

یہی وہ مقامِ انتقامِ ربّ جبّار و قہار ہے، جس میں سردارانِ قریش کی پُرغرور گردنیں کٹ کٹ کر گریں، اور ان گردنوں میں وہ گردنیں بھی شامل تھیں، جنہوں نے مکہ میں کفّار

کے گھر دارالندوہ میں اکٹھا کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ قریش کے ہر ہر قبیلہ کا ایک ایک جوان، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن پر تلوار مار دے تاکہ بنو ہاشم سب سے انتقام لینے سے عاجز رہیں۔

یہی وہ مقتلِ کفار ہے، جس میں نبیؐ کے قتل کی تحریک کا محرک ابوجہل، انصار کے دو کم عمر نوجوانو معوذ اور معاذؓ کے ہاتھوں مارا گیا، گویا سب سے بڑے منتقم نے باز کو اپنی چڑیوں سے مروا ڈالا۔ ابوجہل کے علاوہ عتبہ، امیہ بن خلف، ابوالبختری، زمعہ بن الاسود، عاص بن ہشام اور منبہ وہ تھے، جو مکہ کے دارالندوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منصوبۂ قتل میں شامل تھے، اور یہ سبھی بدر کے مقتل میں منتقم اعلیٰ کی تلوار سے قتل ہوئے۔

بدر کی اس لڑائی میں اللہ اور رسولؐ کے بڑے بڑے دشمن قتل ہوئے اور قریش کا غرور و گھمنڈ برباد ہوا، اور مکہ کے گھر گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ یہ جو کچھ ہوا قریشِ مکہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اللہ کو ایک، اور محمدؐ کو نبی ماننے والوں کو وہ فنا کرنے اور دینِ اسلام کو بُن و بیخ سے اکھاڑنے آئے تھے کہ اللہ نے اُن کی جڑ کاٹ کر رکھ دی تھی، اور یہ بات ہمیشہ کے لیے تاریخ کے اوراق میں بطور ثبوت کے رقم ہو گئی کہ میدانِ حرب میں ساز و سامانِ حرب اور تعدادِ لشکر ہی کافی نہیں ہوتی، بلکہ سامانِ حرب کے ساتھ ساتھ ضربِ حیدری بھی درکار ہوتی ہے، جو اللہ اور اُس کے رسولؐ سے عشق اور اعلائے کلمۃ الحق کے نصب العین کی محبت سے پیدا ہوتی ہے۔

آج حق سربلند اور کفر سرنگوں ہوا تھا۔ آج رمضان المبارک کی سترھویں نہ تھی بلکہ ہلالِ عید تھا، جو اٹھارویں کی شام کو بدر کے میدان پر طلوع ہوا تھا، اور یہی وہ ہلالِ عید ہے جو مشرق و مغرب کے مسلمان ممالک کے پرچموں پر طلوع ہوا ہے اور انشاء اللہ کبھی بھی غروب نہ ہو گا۔

جنگِ بدر (۲ھ / ۶۲۴ء) سے جنگِ پاک و ہند (۱۹۶۵ء) تک کفار کے ساتھ مسلمانوں کی کسی نہ کسی جنگ میں بدر کا ساجذبۂ ایمانی و شوقِ شہادت ضرور جلوہ گر ہوا ہے، اور ہر اُس جنگ میں جہاں مسلمان سپاہی بے تیغ و بے سر و سامانی سے لڑا ہے،

سُرخرو و سربلند ہُوا ہے اور جب بھی جنگِ بدر کا جذبہ سرد ہُوا ہے، توپ تفنگ کا سہارا بھی مسلمان سپاہی کے لیے سرد پڑ گیا ہے۔ مسلمان سپاہی میں جنگِ بدر کی سی حرارتِ ایمانی اور شوقِ شہادت جب تک زندہ ہے، مسلمان زندہ و پائندہ ہے اور جب یہ سرد ہوا تو سمجھ لیجئے کہ مسلمان راکھ کا ڈھیر بنا اور ذلیل و خوار ہُوا۔

بہادران و سردارانِ کفّار کا بدر میں راکھ کا ڈھیر بن جانے کا قریشِ مکہ کو انتہائی قلق تھا۔ اب ابوسفیان اُن کا سردار بنتا ہے، جس کے خونِ فاسد سے معاویہ و یزید جنم لیں گے، جو بزعمِ خویش بنوہاشم سے بدر کا بدلہ محرم ۶۱ھ میں میدانِ کربلا میں سبطِ رسولؐ سے چکائیں گے۔ ابوسفیان نے قریش کا نیا سردار بنتے ہی بتانِ کعبہ کے سامنے منت مانی کہ "جب تک مقتولینِ بدر کا انتقام نہ لوں گا، نہ غسلِ جنابت کروں گا اور نہ سر میں تیل ہی ڈالوں گا۔"

اسیرانِ جنگ میں ایسے ایسے کفّارِ مکہ بھی تھے، جنہوں نے مکہ میں مسلمانوں پر جینا حرام کئے رکھا، انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیں اور زد و کوب کیا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے، جن کے سبّ و شتم اور ظلم و ستم سے تنگ آکر مسلمان اپنے گھر بار، عزیز و اقارب، مال و متاع سب چھوڑ چھاڑ کر مدینہ ہجرت کر آئے تھے۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ "سب قتل کر دیئے جائیں" لیکن حضرت ابوبکرؓ کی رائے تھی کہ "سب اپنے ہی عزیز و اقارب ہیں، فدیہ لے کر چھوڑ دیئے جائیں" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے پسند فرمائی، جس پر یہ فرمانِ خداوندی نازل ہُوا۔

"کسی نبی کو یہ روا نہیں کہ ملک میں اچھی طرح خونریزی کئے بغیر لوگوں کو قیدی بنائے۔ تم دنیا کا سرمایہ چاہتے ہو، اور اللہ آخرت کا، اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے، اگر اللہ نے تمہاری معافی پہلے سے نہ لکھ دی ہوتی تو جو کچھ تم نے لیا، اُس کی وجہ سے بڑا عذاب تم پر نازل ہوتا، خیر جو کچھ تم کو مالِ غنیمت میں ملا ہے اُس کو حلال طیب سمجھ کر کھاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو، وہ بخشنے والا

مہربان ہے۔" (سورۂ انفال)

بدر سے لوٹتے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کو صحابہ میں تقسیم کر دیا اور فرمایا کہ "آرام کے ساتھ رکھے جائیں"۔ صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں قیدیوں کو کھانا کھلاتے اور خود کھانے کی کمی کی بنا پر کھجور پر گزارا کرتے۔ اسیرانِ جنگ کے لیے چار چار ہزار درہم فدیہ مقرر کیا گیا، جب اُن کا زرِ فدیہ مکہ سے پہنچ گیا تو اُنہیں رہا کر دیا گیا، اور جو قیدی ناداری کی بنا پر فدیہ ادا نہ کر سکتے تھے، اُن کے ذمے یہ ہُوا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں اور آزاد ہو جائیں۔

بدر کے اِس معرکے پر غیر جانب دارانہ نظر ڈالنے سے حقائق جو اُبھر کر سامنے آتے ہیں، وہ یہ ہیں۔

(۱) لڑائی سے پہلے اللہ کا نبی، اِس بات پر خوف زدہ نہیں کہ قریشِ مکہ کی تین گنا بڑی جمعیت سے (جو اعلیٰ سامانِ حرب سے لیس ہے) کہیں تین سو تیرہ ۳۱۳ نیم مسلح افراد کی یہ جماعت (جس کی اکثریت انصار کاشت کاروں پر مشتمل ہے) مٹ نہ جائے، بلکہ اِس بنا پر اپنے رب کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم گریہ وزاری کر رہا ہے کہ اُس کا نام لینے والی اگر یہ مختصر سی جماعت مٹ گئی تو پھر ظلم و ضلالت، کفر و شرک کے اندھیاروں میں ڈوبی اس دُنیا کا کیا بنے گا، یعنی اپنی اور اپنے وابستگان کی نہیں، اُسے اللہ کے نام اور دینِ حق کی سربلندی کی فکر ہے، اور یہی انمول بات ہے، جو ماضی کے کسی بھی نبی و رسول کے لبوں سے ادا نہیں ہوئی۔ اس حقیقت کو جانچنے کا بہترین اور قابلِ اعتماد ذریعہ صرف قرآن ہے، اور یہی وہ اُتم اور اُتم بات ہے، جو حضورؐ کو نبیِ اکمل ثابت کرتی ہے۔

(۲) لڑائی میں ایسے ایسے ظالم و سفاک قریشِ مکہ قیدی بن کر ہاتھ لگے تھے، جن کے ہاتھوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے تیرہ برس ان گنت ظلم و ستم

ہے، جنہوں نے نہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ اُن کے سارے خاندان کو شعبِ ابی طالب میں تین برس محصور رکھ کر بھوک و پیاس سے تڑپایا، اور ان میں وہ بھی تھے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کے پیاسے تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کے اس مشورے کو ماننے سے انکار کر دیا کہ قیدیوں کی گردنیں مار دی جائیں، بلکہ اس کے برعکس قیدی حوالے کرتے ہوئے صحابہ کو یہ حکم دیا کہ اُنہیں آرام سے رکھا جائے، اور یہی آپؐ کا وہ عظیم اخلاقِ حسنہ ہے، جو اُنہیں انسانِ کامل ثابت کرتا ہے۔

اِدھر تو اسیرانِ جنگ سے انتہائی شرافت اور نرمی کا برسلوک کیا جا رہا تھا، اُدھر ابوسفیان بدر کا انتقام لینے کی قسم کھائے بیٹھا تھا، سو اُس نے تقریباً تین ماہ بعد ذی الحجہ ۲ھ میں دو سو شتر سوار ساتھ لیے اور مدینہ کے نواح میں عُریض پر حملہ آور ہوا۔ جس سے ایک انصاری حضرت سعد بن عمروؓ شہید ہوئے، گھاس کے چند انبار اور جھونپڑے جلے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر ملتے پر ابوسفیان کا تعاقب کیا، تو وہ اور اُس کے ساتھی اپنی سواریوں کو ہلکا کرنے کے لیے، اُن پر لدے ستو، جو اُن کا سامانِ رسد تھے، پھینکتے ہوئے بھاگ گئے اور اِس چھوٹے سے واقعہ نے غزوۂ سویق (ستو) کا نام پایا۔

اِسی برس ذی الحجہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی شادی، حضرت علیؓ ابن ابی طالب سے ہوئی۔ اِس سے قبل گو آپؐ کی تین صاحبزادیوں حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ کی شادیاں ہو چکی تھیں، لیکن اُن شادیوں کے مہر اور جہیز وغیرہ سے متعلق معلومات نایاب ہیں۔ حضرت فاطمہؓ کی شادی چونکہ اُس زمانے میں ہوئی، جب دینِ اسلام اپنے عروج کی طرف رواں دواں تھا، مسلمانوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور بدر میں کفارِ مکہ پر کاری ضرب لگ چکی تھی، اِس لیے اِس کی تفصیل کسی قدر کتبِ سیرت و تاریخ میں ملتی ہے۔ مہر کی رقم وہ تھی، جو حضرت علیؓ کو

معرکۂ بدر میں ہاتھ آئی زرہ کی فروخت سے حاصل ہوئی، جو بقول سیرت نگاروں اور تاریخ نویسوں کے سوا سو روپے تھی۔ اِس کے علاوہ بھیڑ کی ایک کھال اور ایک پرانی یمنی چادر بھی تھی۔ جہیز سرورِ عالم کی صاحبزادی کا یہ تھا: ایک چارپائی، چمڑے کا ایک گدا جس میں کھجور کے پتے وغیرہ بھرے تھے، ایک چھاگل، ایک مشک یا مشکیزہ، اناج پیسنے کی دو ہاتھ کی چکیاں اور مٹی کے دو گھڑے تھے [1]

یہ ہے اللہ کے نبیؐ کی بیٹی کا مہر اور جہیز، جو مشعلِ راہ ہونا چاہیئے تھا اُمّتِ محمدیہ کے لیے، لیکن اس کی مثال ساری اُمّتِ مسلمہ میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ یوں تو ساری اُمّتِ مسلمہ سوائے محدودے چند غرباء و مساکین کے، شادی بیاہ پر اسراف و تبذیر میں مبتلا نظر آتی ہے مگر پاکستان کے مسلمان، جن پر قیامِ پاکستان سے فراوانی و خوش حالی کے دروازے کھلے ہیں، مہر و جہیز کے معاملے میں ہر حد پھلانگتے جا رہے ہیں۔ شادیوں کو انہوں نے اپنے زر و مال کی نمود و نمائش کا ایک ذریعہ بنا لیا ہے۔ ملکی قانون نے جہیز پر جو قدغن لگائی ہے، اُس کا منہ یوں چڑایا جا رہا ہے کہ جہیز کا مال و اسباب لڑکے والوں کے یہاں پہلے ہی پہنچا دیا جاتا ہے۔ اونچے متوسط طبقے اور امراء کی لڑکیوں کی شادی پر جہیز کی افراط نے متوسط، نچلے متوسط اور غریب طبقے کی لڑکیوں پر شادی کی راہیں محدود بلکہ ایک طرح مسدود کر دی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ طبقے نیچے، بچیوں کی شادیوں کے لیے قرض، رشوت اور بے ایمانی جیسی برائیوں میں مبتلا ہو کر رہ گئے ہیں۔ طرح طرح کی سماجی برائیاں اُمّتِ مسلمہ جس میں مبتلا ہے، اُن میں ایک بڑی برائی شادی بیاہ کی غیر اسلامی رسوم پر خرچ کے اسراف و تبذیر کی ہے، جس کی اسلام میں کوئی گنجائش ہے ہی نہیں۔

مسلمانوں کی تعداد جیسے جیسے بڑھتی جا رہی تھی، اُن کے قدم سرزمین مدینہ میں جمتے جا رہے تھے، ویسے ویسے ارکانِ اسلام کا نفاذ اُن پر کیا جا رہا تھا۔ ۱ھ میں ظہر،

---

[1] سیرت النبی جلد اوّل ص ۳۷۲

عصر و عشاء کی دو دو کی بجائے چار چار رکعتیں ہو گئی تھیں، اب کے رمضان کے روزے بھی فرض ہو گئے۔ صدقہ عید الفطر کا حکم ملا، اور عید کی پہلی باجماعت نماز ادا کی گئی۔

شوال ۳ھ میں کفّارِ مکہ نے بدر میں مارے جانے والے اپنے سرداروں اور بہادروں کا بدلہ لینے کے لیے ایک بار پھر لشکر کشی کی۔ اب کے قریش جوشِ انتقام سے بھرے اور ساز و سامان سے لدے ہوئے تھے، مزید یہ کہ اُن گھرانوں کی عورتیں بھی ساتھ تھیں۔ جن کے خاوند، بھائی یا بیٹے وغیرہ بدر میں قتل ہو چکے تھے تاکہ عورتوں کی عزت و ناموس کی خاطر قریش اب کے بدر سے زیادہ ثابت قدمی دکھائیں اور اُن کا انتقام لیں، جو بدر میں مارے جا چکے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا جناب عباس نے مکہ سے قریش کی لشکر کشی کی اطلاع بروقت پہنچا دی تھی۔ صحابہ کی اکثریت کا مشورہ یہ تھا کہ عورتوں کو شہر سے باہر چھوٹے چھوٹے قلعوں یا گڑھیوں میں بھیج دیا جائے اور کفّارِ مکہ کا مقابلہ شہر بند ہو کر کیا جائے، لیکن وہ نوجوان صحابہ جو معرکۂ بدر شریک نہ ہو سکے، اِس بات پر مصر تھے کہ باہر نکل کر شہر کا دفاع کیا جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات سن کر گھر چلے آئے اور زرہ پہن کر برآمد ہوئے۔ اب وہ صحابہ جو شہر سے باہر نکل کر دفاع کے حق میں تھے، یہ سوچ کر کہ شاید اُنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے خلاف اقدام کا مشورہ دیا ہے، نادم ہوئے اور اپنی رائے سے دست کشی چاہی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "نبی کو زیب نہیں دیتا کہ جب وہ ہتھیار لگا لے تو بے لڑے اُن کو اتار دے"[1]

کفّارِ مکہ کا لشکر جو تین سے پانچ ہزار عساکر پر مشتمل تھا (جس میں زیادہ تر شتر سوار، دو سو گھڑ سوار اور سات سو زرہ پوش تھے) کوہِ اُحد کے قریب خیمہ زن ہوا۔

---

[1] تاریخ الامت جلد اوّل صہ ۱۳۰

حضور[1] ۷ یا ۱۴ [2] شوال ۳ھ بروز جمعہ، نمازِ جمعہ کے بعد ایک ہزار افراد کے ساتھ شہر سے باہر نکلے[3] جن میں رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبّی مع تین سو ساتھیوں کے شامل تھا، جو مدینہ سے نکلتے ہی یہ کہہ کر مع ساتھیوں کے واپس چلا گیا کہ " محمدؐ نے میری رائے نہ مانی، اور چند جوشیلے نوجوانوں کے کہنے سے باہر نکل پڑے، میں نہیں سمجھتا کہ ہم کیوں مفت میں اپنی جانیں دیں۔

اللہ کی راہ میں لڑنے والے اب صرف سات سو باقی رہ گئے اور حضورؐ نے ساتھیوں کی اس طرح صف آرائی فرمائی کہ کوہِ اُحد پشت پر رہا۔ اُحد کے جس درے سے کفّار کے حملے کا احتمال تھا، وہاں پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین کیا اور فرمایا کہ " گو لڑائی میں فتح ہو جائے، تاہم وہ جگہ سے نہ ہٹیں"۔ اس دستے کی کمان حضرت عبداللہؓ بن جبیر کے ہاتھ میں دی۔

طبلِ جنگ پر چوٹ پڑنے کی بجائے، کفّارِ مکہ کی خواتین کے نرم و نازک ہاتھوں نے دفوں پر چوٹ ماری، بدر کے مقتولین کا مرثیہ پڑھا اور پھر ہندیا ہندہ (ابوسفیان کی بیوی) کی معیت میں چودہ عورتیں ذیل کے اشعار پڑھتے ہوئے آگے بڑھیں۔

ہم بیٹیاں ہیں ستاروں کی
ہم چلنے والیاں ہیں قالینوں پر
ہم گلے لگانے والیاں ہیں، پیش قدمی کرنے والوں کو
ہم الگ ہو جانے والیاں ہیں، پیٹھ پھیرنے والوں سے

نقارۂ جنگ پر چوٹ پڑنے سے پہلے دوسری چال کفّار کی طرف سے یہ چلی گئی کہ ابو عامر، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے قبل مدینہ میں اپنے زہد و پارسائی

---

[1] رحمۃٌ للعالمین حصہ اوّل ص ۱۰۸

[2] تاریخ الامت جلد اوّل ص ۱۳۰

[3] سیرت النبی جلد اوّل ص ۳۷۷

کی بنا پر عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور مکہ میں آباد ہو گیا تھا، ڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ میدان میں آکر پکارا "مجھ کو پہچانتے ہو، میں ابو عامر ہوں"۔ انصار نے جواباً کہا "ہاں! او بدکار ہم تجھ کو پہچانتے ہیں، خدا تیری آرزو بر نہ لائے"۔

اب قریش کا علم بردار طلحہ آگے بڑھا اور مسلمانوں پر طنز کی "مسلمانو! تم میں کوئی ہے جو مجھے جلد دوزخ میں پہنچا دے یا خود میرے ہاتھوں بہشت میں پہنچ جائے"۔ حضرت علی مرتضیٰؓ نے مسلمانوں کی طرف سے آگے بڑھ کر کہا "میں ہوں" اور تلوار ماری تو طلحہ کو حسبِ خواہش جہنم میں پہنچا دیا۔ طلحہ کے بعد اُس کا بھائی عثمان آگے بڑھا تو حضرت حمزہؓ نے آگے بڑھ کر تلوار ماری، جو اُس کے کندھے پر پڑی اور کمر تک اُتر گئی اور وہ بھی اپنے بھائی کے پیچھے پیچھے جہنم رسید ہُوا۔

اِس کے بعد دستور کے مطابق فوجیں دست بدست لڑنے لگیں اور اِسی دوران میں ایک حبشی غلام وحشی نامی نے اپنے آقا جبیر بن مطعم کے کہنے پر حضرت حمزہؓ پر اپنا چھوٹا سا نیزہ (جس کو حربہ کہتے تھے) پھینک مارا، جو اُن کی ناف میں لگا اور جسم کے پار ہو گیا، وہ حملے کے لیے آگے بڑھے مگر لڑکھڑا کر گر پڑے اور شہید ہو گئے۔

کُفّارِ مکہ اور مومنینِ مدینہ بڑی بے جگری سے لڑے۔ جب مومنین کے حملوں سے اور حضرت علیؓ اور حضرت ابو دجانہؓ کی بے پناہ بہادری سے کُفّار کے پاؤں اکھڑ گئے تو کُفّار کی بے خوف و بے حجاب خواتین بدحواس ہو کر پسپا ہوئیں تو مسلمان مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑے، جنہیں دیکھ کر پچاس تیر اندازوں کا وہ دستہ، جو اُحد کے درے پر مقرر کیا گیا تھا۔ مالِ غنیمت کی طرف بڑھا۔ حضرت عبداللہؓ بن جبیر نے بہت روکا مگر وہ نہ رکے۔ اِس موقعے کو خالد بن ولید نے غنیمت جانا اور مسلمانوں پر عقب سے حملہ کر دیا۔ چند تیر انداز جو حضرت عبداللہؓ کے کہنے پر رک گئے تھے، لڑتے لڑتے شہید ہو گئے اور خالد بن ولید مسلمانوں پر جھپٹے اور ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ حتیٰ کہ حضرت یمانؓ اپنے مسلمان بھائیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

اِس افراتفری میں صرف گیارہ صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جلو میں رہ گئے، جن میں

حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت زبیرؓ بن العوام، حضرت ابودجانہؓ اور حضرت طلحہؓ کے ناموں کا ذکر ہے، لیکن صحیح بخاری میں روایت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف حضرت طلحہؓ اور حضرت سعدؓ رہ گئے تھے۔

اِس عظیم ہلچل و داروگیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ کعب بن مالکؓ کی نظر جب اُن پر پڑی تو پکارے "مسلمانو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں"۔ یہ سُن کر جاں نثار صحابہ اُس طرف بڑھے، لیکن کُفّار نے بھی اُسی رخ پر پورا زور ڈال دیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا، جب غلبۂ کُفّار دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پکارا "کون ہے؟ جو مجھ پر جان دیتا ہے" حضرت زیادؓ بن سکن مع پانچ انصار کے فدا ہونے کو آگے بڑھے اور ایک ایک کر کے شمعِ رسالت پر جان نثار کر دی۔

آج سرخیلِ عشاقِ نبیؐ حضرت زیادؓ بن سکن کو ایسا شرف حاصل ہوا، جو اس سے پہلے نہ تو معرکۂ بدر میں کسی کو نصیب ہوا، اور نہ بعد میں کسی اُمتی کا مقدر بنا۔ جنگ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیادؓ بن سکن کا جسمِ اطہر لانے کو کہا۔ صحابہ جب اُٹھا کر لائے تو دمِ واپسیں لبوں پر تھا۔ انہوں نے اپنے لب اُن قدموں پر رکھ دیئے۔ جنہیں مقام قاب قوسین وادنیٰ سے سرفراز کیا گیا تھا۔

نبیوں میں کوئی نبی ایسا نہیں، جس کے صحابی اُس کی جان بچانے کو اِس طرح کٹ کٹ کر گرے ہوں، جس طرح حضرت زیادؓ بن سکن اور اُن کے پانچ ساتھی جنگ اُحد میں گرے۔ جرنیلوں میں کوئی جرنیل ایسا نہیں، جس کے سپاہی نے اُس کے قدموں پر لب رکھ کر موت کی آخری ہچکی، اُس عقیدت و احترام سے لی ہو جیسے حضرت زیادؓ بن سکن نے لی۔

جنگِ اُحد تاریخِ اسلامی میں ایسا بے نظیر معرکہ ہے، جس کی نظیر نہ تو تاریخِ اسلامی میں ملتی ہے اور نہ تاریخِ عالم میں کہ جب جناب ابن نضرؓ کو حضرت عمرؓ سے یہ خبر ملتی ہے کہ "رسول اللہ نے شہادت پائی"، تو وہ یہ کہتے ہوئے کہ "اُن کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے" کُفّار کی فوج میں گھستے چلے جاتے ہیں اور اِس طرح لڑ کر شہادت پاتے ہیں

کہ جسمِ اطہر پر تیر، تلوار اور نیزے کے اسّی سے زیادہ زخم پاتے ہیں، اور شہادت کے ان اسّی پھولوں سے سجا جسم ایسا ہے کہ کوئی پہچان نہیں پاتا، تاوقتیکہ جناب ابن نصر رضؓ کی ہمشیرہ بھائی کی شناخت انگلی کے کسی نشان سے کرتی ہیں [1]۔

اِس معرکۂ رستخیز میں کسی کافر نے ایک پتھر مارا، جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لب بھی زخمی ہوئے اور نیچلے میں سے کا سامنا دایاں دانت بھی شہید ہو گیا، پھر قریش کا مشہور بہادر عبداللہ بن قمیہ، صفوں کو چیرتا، حضورؐ کے قریب آگیا اور چہرۂ انور پر تلوار ماری، جس سے مغفر کی دو کڑیاں، رخسارِ رخشاں میں کھب گئیں۔

کفّار کی اِس یلغار میں جاں نثار آپؐ کو اپنے دائرے میں لے لیتے ہیں، چاروں طرف سے تلواریں اور تیر برس رہے ہیں۔ حضرت ابودجانہ رضؓ جھک کر حضورؐ کے لیے سپر بن جاتے ہیں اور جو تیر ہے، اُن کی پیٹھ پر آتا ہے، اُدھر حضرت طلحہ رضؓ تلواروں کے وار ہاتھ پر روک رہے ہیں کہ ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑتا ہے۔

اِس دست بدست جنگ اور کفّار کی اِس یلغار میں یہ ایسے پُرخطر اور جذباتی لمحات تھے کہ کفّار کو کچھ بھی کہا جا سکتا تھا، اُن کی تباہی و بربادی کے لیے کوئی بھی بددعا مانگی جا سکتی تھی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے میں اپنے ربّ سے دعا مانگی بھی تو یہ کہ "اے خدا! میری قوم کو بخش دے، وہ جانتے نہیں"۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انسانِ کامل و نبیِ اکملؐ ہونے کا نہایت واضح ثبوت ہے۔

یہ ہنگامۂ دار و گیر قدرے کم ہوا تو آپؐ مع چند صحابہ کے اُحد کی چوٹی پر چڑھ گئے۔ ابوسفیان نے دیکھ لیا، اور دستہ ساتھ لے کر پیچھا کیا مگر حضرت عمر رضؓ اور دوسرے صحابہ جو ساتھ تھے، نے پتھر برسائے تو رک گیا۔ ابوسفیان کو عبداللہ بن قمیہ (جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر تلوار ماری تھی) نے یہ خبر دی تھی کہ حضورؐ نے شہادت پائی، اور وہ اس کی تصدیق کرنے کو پکارا "یہاں محمد ہیں؟" آپؐ نے

---

[1] سیرت النبی جلد اول صفحہ ۳۸۴-۳۸۲

جواب دینے سے منع کر دیا۔ اب کے ابوسفیان نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو پکارا، مگر پھر بھی کوئی جواب نہ ملا تو پکارا وہ سب مارے گئے۔

حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا، بول اٹھے "او دشمنِ خدا! ہم سب زندہ ہیں"۔

اب سفیان نے نعرہ مارا	ہبل سربلند رہ۔
صحابہ نے حضورؐ کے حکم پر کہا	اللہ برتر اور بزرگ ہے۔
ابوسفیان پھر نعرہ مارا	ہمارے پاس عُزّیٰ ہے اور تمہارے پاس کوئی عُزّیٰ نہیں۔
صحابہ نے جواباً کہا	خدا ہمارا آقا ہے اور تمہارا کوئی آقا نہیں۔

ابوسفیان نے کہا "آج کا دن بدر کے دن کا جواب ہے، ہمارا تمہارا مقابلہ پھر بدر میں آئندہ سال ہوگا فوج نے مردوں کے ناک کان کاٹ لیے ہیں۔ میں نے یہ حکم نہیں دیا تھا، لیکن مجھ کو معلوم ہوا تو کچھ رنج بھی نہیں ہوا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر مدینہ پہنچی تو جنابہ فاطمۃ الزہراؓ نہایت بےتابی سے تشریف لائیں، تو دیکھا ابھی تک چہرہ مبارک سے خون جاری ہے۔

حضرت علیؓ سپر میں پانی بھر کر لائے اور حضرت فاطمہؓ نے زخم دھویا، لیکن جب خون نہ تھما تو چٹائی کا ٹکڑا جلا کر راکھ سے زخم کو بھر دیا، تو خون تھم گیا۔

معرکہ بدر میں حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں ہندیا ہندہ کا باپ عتبہ قتل ہوا تھا، اور جبیر بن مطعم کا چچا بھی، انہیں کے ہاتھوں مارا گیا۔ وحشی (جو جبیر کا غلام تھا اور حربہ اندازی میں کمال رکھتا تھا) کو حضرت حمزہؓ کے قتل پر آمادہ کر کے ہندہ ساتھ لائی تھی۔

وحشی معرکہ احد میں حضرت حمزہؓ کی تاک میں تھا، اُس کا وار کام کر گیا اور حضرت حمزہؓ اُس کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ ہندہ نے اِس پر ہی بس نہ کیا، بلکہ اُن کے ناک اور کان کاٹ ڈالے، آنکھیں نکال لیں، اور سینہ چاک کر کے جگر کا ٹکڑا منہ میں ڈال کر چبایا، نگل نہ سکی تو تھوک دیا۔

یہ وہی ہندہ، ابوسفیان کی بیوی ہے، جس کی آلِ رسولؐ سے دشمنی خون میں

منتقل ہوتی چلی گئی، اِن کے بیٹے معاویہ اور پوتے یزید میں منتقل ہوئی اور آخر محرم ۶۱ھ میں یہ دشمنی سانحہ کربلا میں انتہا کو جا پہنچی۔

معرکۂ اُحد میں ستر صحابہ شہید ہوئے، جن میں سے چار مہاجر اور باقی انصار تھے۔ اسی قدر کفارِ مکہ، معرکۂ بدر میں قتل ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی غربت و افلاس کا یہ حال تھا کہ شہداء کی تکفین کے لیے کپڑا تک نہ تھا۔ حضرت مصعبؓ بن عمیرؓ جنہیں ۱۱ نبوی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعتِ عقبہ اولیٰ میں انصارِ مدینہ کے ساتھ کر دیا تھا کہ وہ انصار کو احکامِ اسلام سکھلائیں، اور جنہوں نے مدینہ میں انصار کے ایک ایک گھر جا کر اسلام کی تبلیغ کی تھی، جس کے نتیجے میں قباء سے مدینہ تک گھر گھر اسلام پھیل گیا تھا۔ یہ معززینِ قریش میں سے تھے، جن کی والدہ خناس، قریشِ مکہ کی معزز عورتوں کے ساتھ بدر کا انتقام لینے اُحد کی جنگ میں آئی ہوئی تھیں، آج معرکۂ اُحد میں شہید ہو گئے۔ انہیں جو کفن میسر آیا، وہ اس قدر چھوٹا تھا کہ پاؤں ڈھانپتے تو سر کھل جاتا تھا، آخر سر ڈھانپ کر پاؤں پر گھاس ڈال دی گئی۔

معرکۂ اُحد جب ختم ہُوا، تو مسلمان غم سے نڈھال اور زخموں سے چُور چُور تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال گزرا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ابوسفیان مسلمانوں کو شکست خوردہ سمجھ کر پلٹ کر حملہ نہ کر دے، اِس لیے اُس کے تعاقب کے لیے ستر صحابہ کی ایک جماعت تیار کی، اور دوسرے دن اُس کا تعاقب حمراء الاسد تک کیا، جو مدینہ سے قریباً آٹھ میل ہے۔ اُدھر ابوسفیان کو روحاء پہنچ کر یہ خیال گزرا کہ وہ اپنے مشن کو نامکمل چھوڑ آیا ہے، لہٰذا پلٹ کر حملہ کرنا چاہیئے مگر اِس دوران میں قبیلہ خزاعہ کا رئیس معبد، جو ایمان تو نہ لایا تھا مگر درپردہ اسلام کا طرف دار تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مل چکا تھا، اور اُسی نے ابوسفیان کو اطلاع دی کہ "میں دیکھ آیا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پورے ساز و سامان کے ساتھ مقابلہ کے لیے آ رہے ہیں۔" سو اِس اطلاع پر ابوسفیان واپس چلا گیا۔

معرکۂ بدر کے بعد مکہ جس طرح قریش کے مقتولین کے غم میں ماتم کدہ بن گیا تھا، اُسی طرح مدینہ آج ماتم کدہ بنا ہُوا تھا۔ ابوسفیان کے تعاقب کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب

مدینہ لوٹے، تو جس گلی کوچے سے گزرتے، ماتم کی آوازیں آتی تھیں۔ اِس گریہ و بکا سے وقتی طور پر مغلوب ہو کر آپؐ نے فرمایا کہ "آہ! حمزہؓ کا کوئی رونے والا نہیں۔

انصار نے حضرت حمزہؓ کے ماتم کے لیے خواتین کو درِ دولت پر بھیج دیا۔ آہ و گریہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر آئے تو دیکھا کہ انصار کی بیویاں حضرت حمزہؓ کی موت پر ماتم کناں ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ "مُردوں پر نوحہ کرنا جائز نہیں"۔

معرکۂ بدر کا ذکر جس طرح سورۂ انفال میں آیا ہے، اُسی طرح معرکۂ اُحد کا تذکرہ سورۂ آل عمران میں یوں ہے۔

"اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا، وہ تو اُس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں اُس کے حکم سے تم ہی اُن کو قتل کر رہے تھے مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی، جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے۔ اِس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔ تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کر دیا، تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا، کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظر عنایت رکھتا ہے۔ یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے، کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمہیں نہ تھا، اور رسولؐ تمہارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا اُس وقت تمہاری اِس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے تاکہ آئندہ کے لیے تمہیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو، اُس پر ملول نہ ہو، اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے ـــــــ اور یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آ پڑی تو تم کہنے لگے یہ کہاں سے آئی، حالانکہ (جنگ بدر میں)

اِس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں (فریقِ مخالف پر) پڑ چکی ہے۔ اے نبیؐ، اِن سے کہو، یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو نقصان لڑائی کے دن تمہیں پہنچا، وہ اللہ کے اذن سے تھا اور اس لیے تھا کہ اللہ دیکھ لے تم میں مومن کون ہیں اور منافق کون۔ وہ منافق کہ جب اُن سے کہا گیا، آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم (اپنے شہر کی) مدافعت ہی کرو، تو کہنے لگے اگر ہمیں علم ہوتا کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔ یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے، اُس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے ـــــ جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسولؐ کی پکار پر لبیک کہا، اُن میں جو اشخاص نیکوکار اور پرہیزگار ہیں، اُن کے لیے بڑا اجر ہے ـــــ دِل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہوگے اگر تم مومن ہو۔ اِس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں، جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں، اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا، جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں۔ (آلِ عمران)

قرآن کی مذکورہ بالا آیات سے جو حقائق اُبھر کر سامنے آتے ہیں، وہ مختصراً کچھ یوں ہیں:

(۱) ابتدا میں مسلمانوں ہی کا پلہ بھاری تھا، لیکن جب مسلمانوں (یعنی اُن پچاس تیر اندازوں کے دستے میں سے اکثر) نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اور کمان دار حضرت عبداللہؓ بن جبیر کے منع کرنے پر بھی غنیمت کی طرف لپکے، تو اِس موقع سے خالد بن ولید نے (جو اُس وقت

لشکرِ کفّار کے ایک رسالہ کی کمان کر رہے تھے) فائدہ اُٹھایا اور پہاڑی کا چکر کاٹ کر اُس درے میں سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ جس کی حفاظت کے لیے حضورؐ نے اُن پچاس تیر اندازوں کے اِس دستے کو متعین کیا تھا، اور یہی مسلمانوں کی شکست کا سبب بنا۔

(۲) خالد بن ولید کے پشت پر سے حملہ کرنے سے حالت یہ ہوئی کہ مسلمانوں پر دونوں طرف سے حملہ ہو گیا، جس سے اُن کی صفوں میں ابتری پھیل گئی اور کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا، اور یہی وہ موقعہ تھا۔ جب غلبۂ کفّار دیکھ کر حضورؐ نے پکارا "کون ہے جو مجھ پر جان دیتا ہے" اور اِس نازک ترین موقعہ پر حضرت زیاد بنؓ سکن اور اُن کے پانچ ساتھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے ڈھال بن گئے اور یکے بعد دیگرے کٹ کٹ کر گرے تھے۔

(۳) مولانا مودودی مرحوم نے سورہ آلِ عمران کے حاشیے میں تحریر کیا ہے کہ مسلمانوں کو "رنج ہزیمت کا، رنج اِس خبر کا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے، رنج اپنے کثیر التعداد مقتولوں اور مجروحوں کا، رنج اس بات کا کہ اب گھروں کی بھی خیر نہیں، تین ہزار دشمن، جن کی تعداد مدینے کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ ہے، شکست خوردہ فوج کو روندتے ہوئے قصبہ میں آگھسیں گے اور سب کو تباہ کر دیں گے[1]

(۴) جنگِ اُحد میں مسلمانوں کے ستّرؐ آدمی شہید ہوئے، بخلاف اِس کے جنگِ بدر میں کفّار کے ستّرؐ آدمی مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے اور ستّرؐ آدمی گرفتار ہو کر آئے تھے[2]

(۵) جنگِ اُحد میں مصیبت جو مسلمانوں پر پڑی، اُن کی اپنی کمزوریوں اور غلطیوں

---

[1] تفہیم القرآن جلد اوّل حاشیہ صفحہ ۲۹۶، ۲۹۵

[2] تفہیم القرآن جلد اوّل حاشیہ صفحہ ۳۰۳-۳۰۱-۳۰۰

کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑا، نبیؐ کے حکم کی خلاف ورزی کی، مال کی طمع میں مبتلا ہوئے، آپس میں نزع و اختلاف کیا، پھر کیوں پوچھتے ہیں کہ یہ مصیبت کہاں سے آئی؟ [1]

(۶) جنگِ اُحد سے نمٹ کر مشرکین جب کئی منزل دور چلے گئے، تو انہیں ہوش آیا، اور انہوں نے آپس میں کہا کہ یہ ہم نے کیا حرکت کی محمدؐ کی طاقت کو توڑ دینے کا جو بیش قیمت موقع ملا تھا، اُسے کھو کر چلے آئے۔ چنانچہ ایک جگہ ٹھہر کر اُنہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ مدینہ پر فوراً ہی دوسرا حملہ کر دیا جائے، لیکن پھر ہمت نہ پڑی اور مکہ واپس چلے گئے۔ اِدھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ اندیشہ تھا کہ یہ لوگ کہیں پھر پلٹ نہ آئیں، اِس لیے جنگِ اُحد کے دوسرے ہی دن آپ نے مسلمانوں کو جمع کر کے فرمایا کہ کُفّار کے تعاقب میں چلنا چاہیئے۔ یہ اگرچہ نہایت نازک موقع تھا مگر پھر بھی جو سچے مومن تھے، وہ جان نثار کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حمراء الاسد تک گئے، جو مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ [2]

(۷) آخر میں مسلمانوں کو یہ تسلی دی گئی ہے کہ دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے، اور ساتھ ہی اِس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ اِس سے قبل تمہارا مخالف فریق یعنی کُفّارِ مکہ ایسی ہی چوٹ کھا چکے ہیں مگر انہوں نے تو ہمت نہ ہاری اور معرکۂ بدر کے تیرہ ماہ بعد ہی اپنی شکست کا بدلہ چکانے کو تم پر حملہ آور آن ہوئے، تو پھر تم کیوں ہمت ہارتے ہو۔

---

[1] تفہیم القرآن جلد اوّل حاشیہ ص ۲۰۳-۲۰۱-۲۰۰

[2] تفہیم القرآن جلد اوّل حاشیہ صفحہ ۲۰۳-۲۰۱-۳۰۰

(۸) بڑی بات یہ کہ اِس راز سے بھی پردہ اٹھایا گیا کہ تم (مسلمانوں) پر اُحد کی مصیبت اِس لیے بھی ڈالی گئی، تاکہ اللہ یہ دیکھ لے کہ تم میں سے سچے مومن کون ہیں اور منافق کون ہیں، جو تمہاری صفوں میں گھس آئے ہیں۔

جنگِ اُحد مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش اور سخت کڑا امتحان تھا۔ اس میں مومنین کا گروہ چھٹ کر الگ ہوگیا، اُن میں ستّر شہید اور بہت سے زخمی ہوئے اور اِن میں سے تین سو منافق وہ بھی نکلے، جنھوں نے رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبیّ کا ساتھ دیا، اور میدانِ کارزار میں پہنچنے سے پہلے ہی پلٹ گئے۔

جنگِ اُحد نے مسلمانوں کو یہ سبق بھی سکھایا کہ نبی یا قائد کے حکم کی خلاف ورزی کے نتائج کیا ہوتے ہیں، یہ ایسا کڑا سبق تھا، جو مسلمانوں کو کبھی بھی بھولنا نہیں چاہیئے تھا مگر اِس پر بھی مسلمان اِس کے بھولنے کے بار بار مرتکب ہوئے ہیں اور جب بھی انھوں نے نبیؐ یا اپنے قائد کے احکام کی خلاف ورزی کی ہے، تو اُحد ہی کی طرح نقصان اُٹھائے اور زخم کھائے ہیں۔

جنگِ اُحد نے یہ سبق بھی مسلمان کو سکھایا کہ مومن کا کام اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جان لڑانا ہے نہ کہ مالِ غنیمت کے لیے۔ جنگ اگر ہے تو دفاعِ دین و ملّت کے لیے نہ کہ مال و متاعِ دنیا کے لیے۔

جنگِ اُحد ۷، یا ۱۴ شوال ۳ھ کو لڑی گئی۔ اِس سے قریباً ایک ماہ قبل یعنی پندرہ رمضان کو امام حسنؓ پیدا ہوئے۔ اسی برس حضورؐ نے حضرت عمر فاروقؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ سے نکاح کیا، جو معرکۂ بدر میں خاوند کے مارے جانے پر بیوہ ہو گئی تھیں۔
اِسی برس حضرت عثمانؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری صاحبزادی حضرت اُم کلثومؓ سے نکاح کیا، کہ پہلی صاحبزادی حضرت رقیہؓ فوت ہو گئی تھیں۔

معرکۂ بدر میں فتح کی بنا پر مسلمانوں کی جو دھاک مدینہ کے گرد و نواح کے قبائل پر بیٹھی تھی، وہ معرکۂ اُحد کی شکست کی دھول میں اُڑ گئی، اور ہر وہ قبیلہ جس میں ذرا بھی دم خم

تھا، یہ سوچنے لگا کہ اسلام کے بانی اور اُس کے پیروکاروں کو ختم کر دیا جائے، تاکہ یہ نیا دین جو لوٹ مار اور غارت گری کو جرم اور حرام قرار دیتا ہے، مٹ جائے، اور جو من مانی وہ ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں، اُس میں روک ٹوک باقی نہ رہے۔ اِن ہی غارت گروں سے مدینہ اور اسلامیانِ مدینہ کو بچانے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اقدام کیے، مؤرخوں نے اُنہیں غزوات اور سرایا کے نام دے ڈالے ہیں، جس سے اسلام کے دشمنوں خصوصاً یورپین مؤرخوں نے ہماری ہی کتب کے حوالوں سے یہ ثابت کرنے میں اپنا زورِ قلم صرف کر دیا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، حالانکہ حقیقتاً یہ غزوات اور سرایا، نہ معرکے تھے، نہ لڑائیاں اور جنگیں، بس یہ تو جھڑپیں تھیں، غارت گروں اور ڈاکوؤں سے اپنی جان و مال، عزت و آبرو، عقیدے و دین کی حفاظت تھی، جو کی گئی، اگر ایک قدم اور آگے بڑھیں اور حقائق کو جنگی حقائق کی نگاہ سے دیکھیں تو معرکۂ بدر کوئی جنگ نہ تھی، کیونکہ تین سو تیرہ کے ایک بے سروسامان گروہ کو (جس میں زیادہ تعداد مدینہ کے نومسلم کھیتی باڑی کرنے والوں کی تھی) کسی طور بھی جنگ جو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ معرکۂ بدر تو ایک دفاعی جھڑپ تھی، جو چند گھنٹوں میں اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ جس میں ستّر غارت گر (قریشِ مکہ) قتل ہوئے اور ستّر پکڑے گئے اور اِدھر دفاع کرنے والوں میں سے صرف چودہ شہید ہوئے، جن میں چھ مہاجر اور آٹھ انصار تھے۔

اب ذرا اُس سلسلۂ غزوات و سرایا پر نظر ڈالتے ہیں، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کتنی بڑی بڑی لڑائیاں اور جنگیں تھیں، جنہیں مسلم مؤرخین اور سیرت نگاروں نے اِس قدر طول دے کر لکھا ہے کہ بعد میں اُن ہی کے حوالے سے یورپین مؤرخین اور سوانح نگاروں نے اپنا پورا زورِ قلم صرف کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ زبردست جنگجویانہ ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے اسلام کو عرب میں بزورِ شمشیر پھیلایا اور اُن کے وصال کے بعد بھی مشن اُن کے خلفائے ثلاثہ یعنی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے جاری رکھا۔

(۱) محرم ۴ھ میں دو شخص طلحہ اور خویلد نے اپنے قبیلہ کو جو قطن میں آباد تھا،

مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے تیار کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر ملنے پر حضرت ابوسلمہؓ کی قیادت میں ایک سو پچاس مہاجرین وانصار کا دستہ اُن کی سرکوبی کے لیے بھیجا، لیکن کوئی جھڑپ تک نہ ہوئی کیونکہ حملے کا ارادہ رکھنے والے منتشر ہو گئے لیکن اِس واقعہ کو مسلم مؤرخوں نے سریہ ابی سلمہ کا نام دے دیا۔

(۲) محرم ہی کے مہینے میں سفیان بن خالد (جو بنی لحیان کا سردار تھا) نے مدینے پر حملے کا قصد کیا، جس کے سدِباب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہؓ بن انیس کو بھیجا، جنہوں نے کسی بہانے سفیان کو قتل کر ڈالا اور معاملہ ختم ہوا۔ اس فتنہ گر کی سرکوبی نے سریہ ابن انیس کا نام پایا۔

(۳) صفر میں بنی کلاب کے ایک شخص ابو براء نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ کچھ لوگوں کو میرے ساتھ کر دیجئے تاکہ میرے قبیلے میں تبلیغِ اسلام کریں۔ حضورؐ نے سترؓ آدمی اس کام کے لیے اُس کے ساتھ کر دیئے۔ انہوں نے راستے میں بیرِ معونہ میں قیام کیا اور حرام بن ملحان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خط دے کر قبیلے کے رئیس عامر بن طفیل کے پاس بھیجا، جس نے حرام کو قتل کر دیا۔ عُصَیَّہ، رعل اور ذکوان کے قبائل کو لے کر مسلمانوں کی طرف بڑھا اور انہوں نے اِن نہتے مبلّغینِ اسلام کو گھیر کر قتل کر دیا، صرف عمروؓ بن امیہ کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ "میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی، میں تجھ کو آزاد کرتا ہوں۔"

اب مسلم مؤرخ ہی یہ بتا سکتے ہیں کہ سریہ کو بھیجی گئی یہ فوج تھی یا تبلیغی جماعت، جس کی اکثریت اُن درویشوں پر مشتمل تھی، جو مسجدِ نبوی کی بغل میں بنے چبوترے (صفّہ) پر رہا کرتی تھی، اللہ اللہ کیا کرتی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے سیر ہوا کرتی تھی۔ فاقہ مست اللہ والوں کا یہ قتل بھی سریہ کہلایا ہے۔

(۴) اُن ہی دنوں اِسی قسم کی دھوکہ دہی کا ایک اور واقعہ پیش آیا، جس میں دس مبلّغین اسلام کو عضل اور قارہ کے قبائل کے چند آدمیوں کے کہنے پر، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغِ اسلام کے لیے بھیج دیا مگر جب یہ لوگ رجیع کے مقام پر پہنچے تو مبلّغین

کو ساتھ لانے والوں نے تبلیغی جماعت کے ساتھ غداری کی اور قبیلہ بنو لحیان کو اشارہ کر دیا، جن کے دو سو آدمیوں نے اِن نہتے مسلمانوں پر حملہ کر دیا، آٹھ تو وہیں شہید ہو گئے اور دو کو پکڑ کر کُفّارِ مکہ کے ہاتھوں فروخت کر دیا، جن میں ایک حضرت خبیبؓ تھے (جنہوں نے جنگِ اُحد میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا) انہیں حارث کے لڑکوں نے خریدا، اور چند دن قید رکھنے کے بعد قتل کر دیا۔ دوسرے حضرت زیدؓ تھے، جنہیں صفوان بن امیہ نے خریدا، اور اُس کے غلام نطاس کی تلوار نے انہیں جامِ شہادت پلایا۔ کُفّار کی دھوکہ دہی کا یہ واقعہ بھی اسلامی لڑائیوں میں مسلم مؤرخین نے شامل کر لیا ہے۔

اس برس کے چند متفرق واقعات، شعبان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حضرت حسین کی پیدائش، ازواجِ مطہرات میں حضرت زینبؓ کا انتقال ہے، جن سے اِسی برس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کیا تھا۔ اسی برس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُمِ مسلمہؓ سے نکاح کیا۔

مذکورہ بالا سرایا (جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک نہ ہوئے بلکہ صحابہ میں سے کسی صحابی نے دستے یا گروہ کی قیادت کی) کے بعد اب غزوات (جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مومنین کی قیادت فرمائی) پر ایک نظر ڈالنی ضروری ہے۔

(۱) شوال ۲ھ میں غزوۂ قینقاع کی اصل یہ ہے کہ ایک انصاری کی بیوی کسی یہودی کی دکان پر سودا سلف لینے گئی، جس کی یہودیوں نے بے حرمتی کی، یہودیوں کی اِس دیدہ دلیری کو دیکھ کر بازار میں موجود ایک مسلمان کی غیرت نے جوش مارا، اور اُس نے ایک یہودی کو مار ڈالا، تو یہودیوں نے اُسے شہید کر ڈالا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس واقعہ کا جب علم ہوا تو آپؐ یہودیوں کے پاس گئے اور فرمایا کہ "خدا سے ڈرو، ایسا نہ ہو تم پر بھی بدر والوں کی طرح عذاب آئے"۔ یہودیوں نے اکڑ کر جواب دیا۔ "ہم قریش نہیں ہیں، ہم سے معاملہ پڑے گا، تو ہم دکھائیں گے کہ لڑائی اس کا نام ہے۔"

اپنے اِس قول سے یہودیوں نے وہ عہد توڑ ڈالا، جو مدینہ میں ۱ھ میں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن میں طے پایا تھا۔ یہ ایک طرح مسلمانوں کو کھلا چیلنج تھا کہ آؤ اور ہم سے دو دو ہاتھ کر کے دیکھ لو، بدر کی فتح پر نہ اتراؤ۔

مسلمانوں اور یہود کو جب آمنے سامنے ہونے کا موقعہ ہُوا، تو بنی قینقاع قلعہ بند ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے پندرہ دن محاصرہ کیا۔ آخر عبداللہ بن اُبی کی تجویز پر جو در پردہ یہود کا دوست تھا، جلا وطن کر دیئے گئے۔ جلا وطن ہونے والے یہ سات سو یہودی شام کے علاقے اذرعات چلے گئے۔

(۲) غزوہ بنو نضیر ربیع الاوّل ۴ھ میں پیش آیا، جس کی ابتداء یوں بیان کی گئی ہے کہ بیر معونہ کے واقعہ، جس میں تبلیغی جماعت کے اُنہتر ۶۹ صحابہ شہید ہوئے تھے اور صرف ایک کو چھوڑ دیا گیا تھا، جو حضرت عمروؓ بن امیہ تھے۔ جنہوں نے واپسی پر بنی عامر کے دو ۲ آدمیوں کو اِس بنا پر قتل کر دیا کہ اُن کے قبیلے نے تبلیغی جماعت کو تہ تیغ کر دیا تھا مگر اُن دو ۲ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم امان دے چکے تھے، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن دونوں کا خون بہا، دینے کا اعلان کر دیا تھا۔ اِسی خون بہا کا ایک حصہ جو معاہدے کی رو سے یہود پر واجب الادا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے مطالبے کے لیے بنو نضیر کے پاس گئے، گو انہوں نے خون بہا کا حصہ دینا قبول کر لیا، لیکن ساتھ ہی ایک شخص کو اُس مکان کی چھت پر بھیج دیا، جس کی دیوار کے سائے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے تھے تاکہ اوپر سے آپؐ پر پتھر گرا دے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے یہود کے اِس ارادے سے باخبر کر دیا، اور آپؐ واپس چلے آئے۔

بنو نضیر نے اب چال یہ چلی کہ حضورؐ کو کہلا بھیجا کہ آپ تیس آدمی لے کر آئیں، ہم بھی اپنے احبار لے کر آئیں گے۔ آپ کا کلام سن کر اگر ہمارے احبار آپ کی تصدیق کریں گے تو ہم کو بھی کچھ عذر نہ ہوگا۔ چونکہ در پردہ وہ بغاوت کی تیاری کر چکے تھے اِس لیے آپ نے کہلا بھیجا کہ جب تک تم معاہدہ نہ لکھ دو، مجھے تم پر اعتماد نہیں مگر وہ اس پر راضی نہ ہوئے، اس کے برعکس یہود کے دوسرے قبیلے بنی قریظہ نے

تجدید معاہدہ کو مان لیا۔

بنو نضیر اِس بات پر اکڑے ہوئے تھے کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبیؓ نے انہیں کہلا بھیجا تھا کہ تم اطاعت نہ کرنا۔ بنو قریظہ تمہارا ساتھ دیں گے، اور میں بھی دو ہزار آدمیوں کے ساتھ تمہاری مدد کروں گا۔ لیکن جب حضورؐ نے بنو نضیر کے قلعے کا محاصرہ کیا، تو بنو قریظہ نے اس لیے ساتھ نہ دیا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تجدیدِ معاہدہ کر چکے تھے اور عبداللہ بن اُبیّ چونکہ اسلام قبول کئے ہوئے تھا، اِس لیے اعلانیہ سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ محاصرہ پندرہ دن جاری رہا اور آخر کار بنو نضیر اِس پر راضی ہو گئے کہ جس قدر مال و اسباب وہ اونٹوں پر لاد کر لے جا سکیں گے، لے جائیں گے۔ چنانچہ بنو نضیر اِس شان سے نکلے کہ جشن کا سا گمان ہوتا تھا۔ خیبر کے یہودیوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ ہتھیاروں کے ذخیرے میں جو یہ لوگ چھوڑ گئے، پچاس زرہیں، پچاس خود اور تین سو چالیس تلواریں تھیں،،[1]

اِس بات کا ثبوت مہیا کرنا، سب سے پہلے مورخین اور سیرت نگاروں پر ہے کہ بنو نضیر کے ساتھ کونسی جنگ لڑی گئی یا معرکہ پیش آیا تھا، جسے غزوۂ بنو نضیر کا نام دے دیا گیا۔ یہی اور اس قسم کی تاریخی سقم ہیں، جو مخالفین اسلام کے ہاتھ لگے اور جنہیں بڑھا چڑھا کر انہوں نے ہمارے ہی منہ پر دے مارا ہے۔ جس سے نہ صرف اُنہوں نے عیسائی دنیا کے نصارا و یہود کو اسلام کے خلاف اُبھارا، بلکہ اُن نام نہاد پڑھے لکھے مسلمانوں کو بھی گمراہ کیا، جنہوں نے اسلامی تاریخ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو انگریزی کتب سے پڑھا ہے اور اُس پر بغیر کسی غور و فکر کے درست تسلیم کر لیا ہے۔

(۳) غزوات میں اِسی قبیل کے تین اور واقعات پیش آئے۔ ایک واقعہ ذات الرقاع کا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر ملی کہ انمار اور ثعلبہ کے لوگ مدینہ پر حملے کی تیاریوں میں ہیں تو آپؐ اِس حملے کو روکنے کے لیے چار سو صحابہ کو لے

---

[1] سیرت النبی جلد اوّل صـ ۴۱۹

کر ۱۰ محرم ۵ھ کو ذات الرّقاع تک گئے، لیکن وہ لوگ مسلمانوں کے اِس دستے کی آمد کی خبر سن کر پہاڑوں میں بھاگ گئے۔

(۴) دوسرا واقعہ یوں ہے کہ دومۃ الجندل میں کُفّار کی ایک بڑی جمیّت کے اکٹھا ہونے کی خبر جب حضورؐ کو ملی تو آپ ربیع الاوّل ۵ھ میں ایک ہزار صحابہ کو ہمراہ لے کر دومۃ الجندل تک بڑھے تو کُفّار مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر بھاگ گئے۔

(۵) شعبان ۵ھ میں تیسرا واقعہ غزوۂ مُریسیع یا غزوۂ بنی مصطلق کا ہے، جو دوسرے واقعات سے صرف اِس قدر مختلف ہے کہ اِس میں مُریسیع کی آبادی نے ذات الرّقاع اور دومۃ الجندل کے لوگوں کی طرح راہِ فرار اختیار کرنے کی بجائے، مسلمانوں کے دستے کا مقابلہ کیا، جس میں شکست کھائی۔ دس اہلِ مُریسیع قتل اور چھ سو گرفتار ہوئے۔ غنیمت میں دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں۔

یہ واقعہ اِس طرح پیش آیا کہ ایک خاندان جو بنو المصطلق کہلاتا تھا، مدینہ سے ۹ منزل پر آباد تھا۔ اِس خاندان کا رئیس حارث بن ابی ضرار تھا، جس نے قریشِ مکہ کے اشارے سے مدینہ پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں تھیں، اس کی تصدیق کے لیے حضورؐ نے حضرت زیدؓ بن خصیب کو بھیجا، جب خبر کا درست ہونا ثابت ہو گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ۲ شعبان ۵ھ کو مع صحابہ کے مُریسیع روانہ ہوئے۔ مسلمانوں کی آمد کی خبر پر حارث اور اُس کے حواری تو مُریسیع سے نکل بھاگے، لیکن باقی آبادی نے جم کر تیروں سے مقابلہ کیا۔ مسلمانوں نے بڑھ کر جب ایک ساتھ حملہ کیا، تو اُن کے پاؤں اکھڑ گئے۔

اِس جھڑپ میں مالِ غنیمت کے علاوہ جو چھ سو لوگ گرفتار ہوئے، اُن میں حارث بن ابی ضرار کی بیٹی بھی تھیں۔ دستور کے مطابق جب مالِ غنیمت تقسیم ہُوا، تو وہ حضرت ثابتؓ بن قیس کے حصے میں آئیں مگر انہوں نے حضرت ثابتؓ کو اِس بات پر راضی کر لیا کہ وہ کچھ رقم لے کر اُنہیں آزاد کر دیں گے، چونکہ روپیہ پاس نہ تھا، اس لیے حضورؐ سے مدد چاہی

اور اُنہوں نے روپیہ ادا کر دیا، اور اُن کے آزاد ہونے پر اُن سے نکاح کر لیا۔

دوسری روایت یوں ہے کہ شکست کے بعد اہلِ مُریسیع جب صحابہ میں بطور لونڈی، غلام کے تقسیم ہو گئے تو حارث نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ میری بیٹی بطور رئیس کی بیٹی کے لونڈی نہیں بن سکتی! لہٰذا اُسے آزاد کر دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ بہتر یہ ہو گا کہ یہ معاملہ تمہاری بیٹی کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے، چنانچہ حضرت جویریہ رضؓ نے حضورؐ کی خدمت میں رہنا پسند کیا، لہٰذا آپؐ نے اُن سے شادی کر لی۔ بہر طور حضرت جویریہ رضؓ سے حضورؐ کے نکاح کا یہ فائدہ ہُوا کہ اہلِ مُریسیع کے چھ سو مرد و زن جو مسلمانوں کے لونڈی غلام بن گئے تھے، آزاد کر دیئے گئے، کیونکہ بنو المصطلق اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار بن گئے تھے۔

۵ھ کا سب سے بڑا واقعہ تاریخِ اسلام میں غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق کے نام سے درج ہے۔ اِس واقعہ سے مدینہ میں پانچ برس گزر جانے پر بھی مسلمانوں کی معاشی حالت اور حربی قوت کی جو حالت تھی، عیاں ہوتی ہے اور عرب میں اسلام دشمن طاقتوں کا دم خم بھی ظاہر ہوتا ہے، اور یہ واقعہ مخالفینِ نبوت و اسلام کا نکتۂ عروج بھی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مدینہ منورہ میں دہ سالہ دورِ حیات کا قریبًا نصف بھی، لہٰذا اِس واقعے کا قدرے تفصیل سے جائزہ لینا ضروری ہے۔

بنو نضیر کو مدینہ میں اپنے گھر بار چھوڑنے کا قلق تھا۔ انہوں نے خیبر میں اپنے پاؤں جما کر نبیِ اسلامؐ اور مسلمانوں کے خلاف سازش کا آغاز کر دیا۔ اُن کے رئیس پہلے مکہ جا کر قریش سے ملے تاکہ قریش کو ساتھ ملا کر اسلام کو ملیا میٹ کر دیں۔ قریش تو اِس کام کے لیے ہمیشہ سے تیار تھے ہی۔ قریش کو آمادۂ پیکار پا کر یہ لوگ قبیلہ غطفان سے ملے اور خیبر کی پیداوار کے نصف دینے کا وعدہ کر کے انہیں بھی ساتھ ملا لیا۔ بنو اسد غطفان کے حلیف تھے، سو وہ بھی غطفان کے کہنے پر ساتھ دینے پر تیار ہو گئے۔ قبیلہ بنو سلیم کی قریشِ مکہ سے قرابت داری تھی، اپنے اِس تعلق کی بنا پر وہ بھی اِن قبائل کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ بنو سعد کا قبیلہ یہود کا پہلے سے حلیف تھا، اُس نے بھی حملے میں ساتھی

بلنے پر آمادگی ظاہر کردی۔ غرض اِس طرح مکہ اور مدینہ کے گردونواح کے تمام قبائل نے یک جان ہوکر اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا مصمم ارادہ کرلیا اور مؤرخین نے قبائل کے اِس لشکر کی تعداد دس ہزار تحریر کی ہے۔

یہود و کفار کی اِس عظیم سازش کا علم جب حضورؐ کو ہوا، تو انہوں نے مدینہ اور اُس میں بسنے والے مسلمانوں کے دفاع سے متعلق صحابہ سے صلاح مشورہ کیا، اور جناب سلمان فارسیؓ کی اس رائے پر اتفاق ہوگیا کہ اِس عظیم لشکر کا مقابلہ کھلے میدان کی بجائے، خندق سے محصور ہوکر کیا جائے۔

سلع کی پہاڑی، مکانات اور نخلستان وغیرہ مدینہ کو تین اطراف سے ایک طرح محفوظ کئے ہوئے تھے، لیکن شہر کا شامی رُخ جو کھلا تھا، اُس پر خندق کھودی جانے لگی۔ حضورؐ نے دس دس صحابہ کی ٹولی پر دس دس گز زمین تقسیم کردی۔ بیس[۲] دن میں قریباً تین ہزار صحابہ نے یہ خندق کھودی۔ اِس خندق کے کھودنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی بھی برابر کی شریک رہی۔

اللہ کے دین کا دفاع کرنے والوں کی یہ حالت یہ تھی کہ کھانے کو جو کی روٹی تک نہ تھی، پیٹ میں فاقہ ہے، لیکن کمر کو جھکنے سے بچانے کے لیے پیٹ پر پتھر بندھے ہیں اور اللہ کے یہ مقدس مزدور اُس کی حمد و ثنا کے گیت گاتے خندق کھودتے اور پشتوں پر مٹی لادلاد کر کناروں پر ڈال رہے ہیں۔

جاڑے کے بیس دن کے فقروفاقہ میں قریباً پانچ گز گہرائی کی یہ خندق جب کھد چکی تو مسلمانوں نے ایک طرح خود کو محصور کرلیا۔ اُدھر یہود نے اپنی فتح کو یقینی بنانے کے لیے مسلمانوں پر آخری ضرب یہ لگائی کہ بنو قریظہ کے یہودیوں کو (جو تاحال معاہدے کی رو سے مسلمانوں کے حلیف تھے) بھی ساتھ ملالیا، اور یہ یہود و کفار کا یہ ٹڈی دل بادل لشکر مدینہ پر اُمڈ آیا، جس کی حقیقت قرآن نے اِن الفاظ میں بیان کی ہے۔

"جب دشمن بلندی اور پستی کی طرف سے تم پر آئے، آنکھیں پتھرانے لگیں اور دل منہ تک اچھلنے لگے اور تم اللہ کے بارے طرح طرح کے گمان کرنے

لگے۔ تب مسلمانوں کی آزمائش کا وقت آگیا اور سخت زلزلہ اُن پر طاری ہوگیا۔" (سورۂ احزاب)

آزمائش کے اِس وقت منافقوں نے گل یہ کھلایا کہ مدینے کے ان محافظوں کا اِس بہانے ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا کہ شہر میں ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں۔ جس پر قرآن کی شہادت یوں ہے۔

"کہتے ہیں کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں اور کھلے نہیں، بلکہ اُن کو بھاگنا مقصود ہے۔" (سورہ احزاب)

سلع کی پہاڑی، شہر کی گڑھیوں، نخلستانوں اور خندق کے اِس پار پناہ گزین ہو جانے والے اہلِ مدینہ کا محاصرہ دشمن نے ایک مہینہ تک جاری رکھا، اور اِدھر صحابہ کی حالت یہ ہو گئی کہ فاقے پر فاقہ آنے لگا۔ ایک دن بعض صحابہ نے بے چین ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حالتِ زار دکھائی کہ اُن کے پیٹوں پر پتھر بندھے ہیں، اِس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے شکم پر سے جب پٹی ہٹائی تو اُس کے نیچے دو پتھر بندھے تھے۔

خندق تو مسلمانوں نے اپنی حفاظت کے لیے کھودی تھی، وہ کیوں کر عبور کرتے، اور اُدھر کفار و یہود اُسے بآسانی پھلانگنے پر قادر نہ تھے، اس لیے تیر اور پتھر برساتے تھے، چونکہ اِس طرح کامیابی کی کوئی اُمید نہ تھی، اِس لیے عام حملہ ضروری قرار پایا، اور اُس جگہ سے جہاں خندق کی چوڑائی قدرے کم رہ گئی تھی، قریش کے چند بہادر گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے خندق پھلانگ گئے، جن میں قریش کا مشہور بہادر عمرو بن عبدوُد بھی تھا، اور اُسی نے سب سے پہلے مسلمانوں میں سے بدمقابل کے لیے للکارا، تو حضرت علیؓ اُٹھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنہیں ایسے نامور بہادر کے مقابلے میں جانے سے روکا، لیکن جب کوئی دوسرا مقابلے کو تیار نظر نہ آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اپنے دستِ مبارک سے تلوار عطا کی اور اُن کے سر پر عمامہ باندھ کر اجازت دے دی۔

عمرو بن عبد ود، حضرت علیؓ کو پیادہ دیکھ کر گھوڑے سے نیچے اُتر آیا اور پہلا وار کیا، جسے حضرت علیؓ نے اپنی ڈھال پر روکا تو ڈھال کٹ گئی اور حضرت علیؓ کی پیشانی پر ہلکا سا زخم بھی آیا، جواباً حضرت علیؓ نے وار کیا اور عرب کے اِس نامور بہادر کا شانہ کاٹ کر رکھ دیا۔

عمرو کے بعد ضرار اور جبیرہ حضرت علیؓ کی طرف بڑھے مگر اُنہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ حضرت عمرؓ نے ضرار کا تعاقب کیا، مگر مقابلہ نہ ہُوا۔ عرب کا تیسرا بہادر نوفل بھاگتے ہوئے خندق میں جا گرا، صحابہ تیر مارنے لگے تو اُس نے کہا کہ "میں شریفانہ موت، چاہتا ہوں"۔ چنانچہ حضرت علیؓ خندق میں اُترے اور تلوار سے لڑ کر اُسے شرافت کی موت سے ہم کنار کیا۔

مومنات کو جس قلعے میں رکھا گیا تھا، وہ بنو قریظہ کی آبادی سے قریب تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ مقابلے کے لیے خندق پر ہیں، یہودی قلعے پر حملے کا منصوبہ بنانے لگے۔ ایک یہودی موقعہ پا کر حالات کی گن سن لینے کو قلعے کے پھاٹک تک آن پہنچا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہؓ نے خیمے کی چوب اِس زور سے یہودی کے سر پر ماری کہ اُس کا سر پھٹ گیا اور بعد میں اُس کا سر کاٹ کر قلعے کی دیوار سے نیچے پھینک دیا، جس سے یہودیوں کو یقین ہو گیا کہ قلعہ میں مستورات کے علاوہ مرد بھی ہیں، سو اُنہوں نے حملے کی جرأت نہ کی۔

بس یہی ایک جھڑپ تھی جو معرکۂ خندق میں فریقین کے مابین ہوئی اور محاصرہ جاری رہا۔ محصور ہو جانے اور ذرائع کی کمی کے باعث مسلمان فقر و فاقہ کی حالت میں تو تھے ہی مگر محاصرے کی طوالت کا شدید اثر حملہ آوروں پر ہُوا کہ اُن کی تعداد دس ہزار تھی، جسے رسد کا بہم پہنچانا اُس زمانے میں اور خصوصاً عرب کے کوہستانی و ریگستانی علاقے میں کچھ آسان کام نہ تھا۔ دوسرے سردی کے موسم میں طوفانی ہوائیں چلنے لگیں (جو سردیوں کے موسم میں عرب کے بہت سے علاقے میں آج بھی کئی کئی دن چلتی اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے کر دیتی ہیں) جس نے حملہ آوروں کے خیمے اور کھانے کے دیگچے تک اُلٹ دیئے۔ رسد کی قلت،

موسم کی شدّت اور خندق کی جدت (اِس سے قبل عربوں کو خندق کی ایسی روک والی جدت سے کبھی واسطہ نہ ہوا تھا) حملہ آوروں کے لیے بڑی حوصلہ شکن واقع ہوئی، اور ساتھ ہی حضرت نعیمؓ بن مسعود اشجعی نے ایک بڑا سیاسی کردار ادا کیا، جس سے کفّارِ مکہ اور یہود مدینہ و خیبر ایک دوسرے سے بدظن ہو گئے۔

حضرت نعیمؓ بن مسعود غطفان کے رئیس تھے، جو اسلام لا چکے تھے مگر قریش و یہود کو خبر نہ تھی۔ اُنہوں نے یہود سے کہا کہ "قریش تو اِن ناساز گار حالات میں زیادہ ٹھہرنے کے نہیں، وہ تمہیں چھوڑ کر مکہ چلے جائیں گے مگر تمہاری اور مسلمانوں کی سرزمین تو ایک ہے، تم کیوں مسلمانوں کی ہمیشہ کی مخالفت مول لیتے ہو، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ قریش فتح حاصل کئے بغیر نہیں جائیں گے، تو پھر بطور ضمانت اُن کے کچھ معززا پنے یہاں منگوا لو"۔ مگر قریش نے یہود کو ایسی ضمانت دینے سے انکار کر دیا، تو بنو قریظہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مصالحت کی یہ شرط پیش کر دی کہ بنو نضیر جو مدینہ سے جلاوطن ہو کر خیبر جا آباد ہوئے ہیں، اُنہیں دوبارہ مدینہ آنے کی اجازت دے دی جائے۔

حضرت نعیمؓ بن مسعود کو بنو قریظہ کی مصالحت کی یہ شرط معلوم ہو چکی تھی، سو انہوں نے راز کی یہ بات قریش کو جا بتلائی کہ بنو قریظہ جن پر تم اِس قدر اعتماد کئے بیٹھے ہو، مسلمانوں سے مصالحت کو تیار ہو گئے ہیں۔ حضرت نعیمؓ بن مسعود کی یہ سیاسی چال بہت کامیاب رہی، جس سے یہودِ مدینہ و خیبر اور کفّارِ مکہ میں پھوٹ پڑ گئی، اور انہوں نے بے کار کے اِس محاصرے کو ختم کر دیا۔

یہ سب کچھ جو ظہور پذیر ہوا، اِس میں منشائے خداوندی اور رضائے الٰہی مسلمانوں کے لیے کام کر رہی تھی مگر دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس راز کو قرآن نے یوں افشا کیا ہے۔

"مسلمانو! خدا کے اِس احسان کو یاد کرو، جب کہ تم پر فوجیں آ پڑی ہیں، تو ہم نے اُن پر آندھی بھیجی اور فوجیں بھیجیں، جو تم کو دکھائی نہیں دیتی تھیں"۔ (سورۂ احزاب)

کفارِ مکہ و قبائلِ عرب اور یہودِ مدینہ و خیبر دس ہزار کے جس عظیم لشکر کو لے کر مسلمانوں کا قلع قمع کرنے اور دینِ اسلام کو بُن و بیخ سے اکھاڑنے آئے تھے ، بے کار و بے سود ثابت ہُوا۔ اُن کی ہر تدبیر اُلٹ گئی مگر اللہ کے ایک بندے اور نبیؐ کے ایک پیارے صحابی جناب سلمان فارسیؓ کی ایک تدبیر کام کر گئی اور وہ مقدس خندق ، جسے تین ہزار قدسیوں نے نبیِ اکرمؐ کی معیت میں بیس دن کے فقر و فاقہ میں کھودا تھا ، ایسی سدِ سکندری اور ہمالۂ عظیم ثابت ہوئی کہ دشمنانِ نبوت و اسلام غیظ و غضب میں اپنی انگلیاں چباتے رہ گئے ، مگر اُسے عبور نہ کر سکے اور جنہوں نے عبور کیا ، گویا زندگی کی سرحد عبور کر گئے۔

اِن ناموافق و ناسازگار حالات کو دیکھ کر کفّار کے سالارِ اعظم ابوسفیان نے اعلان کیا کہ " رسد ہو چکی ، موسم کا یہ حال ہے ، یہود نے ساتھ چھوڑ دیا ، اب محاصرہ بیکار ہے " اور کوچ کا نقارہ بجانے کا حکم دے دیا ۔ قبیلہ غطفان کے لوگ قریش کے ساتھ روانہ ہو گئے ۔ بنو قریظہ محاصرہ اُٹھا کر اپنے قلعوں میں چلے گئے اور اس طرح مدینے کے اُفق پر چڑھی کفر کی یہ آندھی بیس بائیس دن بعد چھٹ گئی ، اور قرآن نے اِس واقعے کی شہادت یوں دی ہے ۔

" اور خدا نے کافروں کو غصہ میں بھرا ہُوا ہٹا دیا کہ اُن کو کچھ ہاتھ نہ آیا اور مسلمانوں کو لڑنے کی نوبت نہ آنے دی " (سورہ احزاب)

غزوۂ خندق کتنی بڑی جنگ تھی ، اِس میں کیا کچھ ہُوا ، قرآن نے سب کچھ نہایت جامع الفاظ میں مختصراً بیان کر دیا ہے ، لیکن حیرانی ہے اُن مؤرخینِ اسلام پر اور پھر اُن عیسائی مؤرخین پر جنہوں نے اِسے ایک بڑی جنگ کی صورت میں پیش کیا ہے ۔

ہاں ! اِس میں شک و شبہ نہیں کہ عرب کے کفّار و یہود کی اسلام کے خلاف یہ ایک گہری سازش اور عظیم حملہ تھا ۔ مسلمانوں پر یہ ایسا کڑا وقت تھا ، جس میں بقولِ قرآن اُن کی آنکھیں پتھرانے لگیں ، کلیجے منہ کو آنے لگے اور وہ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے تھے ۔ شاید یہ کہ انہیں کیوں بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا ہے ، لیکن یہ تو اُن کی

آزمائش کا وقت تھا، اور اِس آزمائش میں انہوں نے نہایت ثابت قدمی دکھائی اور اپنے نبیؐ کے سے سرتابی بھی نہیں کی تھی۔ یہ وہ تین ہزار قدسی تھے، جنہوں نے فاقے کاٹے، پیٹوں پر پتھر باندھے اور خندق کو مسلسل بیس دن تک کھودتے چلے گئے تھے۔

کفّار کے محاصرے کے دنوں میں تین تین فاقوں کی آزمائش سے جب بے تاب ہو کر اُنہوں نے اللہ کے نبیؐ کے سامنے پیٹوں پر بندھے ہوئے پتھر دکھائے، تو وہ جو انسانِ کامل تھا، شکم پر بندھا کپڑا اٹھانے پر مجبور ہو گیا، تاکہ دیکھنے والے دیکھ لیں اور بعد میں آنے والے سن لیں کہ اُس کے پیٹ پر ایک کی بجائے دو پتھر بندھے تھے یعنی اُس کا فاقہ ساتھیوں و حواریوں سے دگنا تھا مگر اِس آزمائش سے وہ بے تاب نہ تھا، اور نہ ہی پیٹ پر سے کپڑا ہٹا کر اُس نے کسی کو دکھایا تھا کہ دیکھنے والا تو دیکھ ہی رہا تھا تو اور کسی کو دکھانا کیا!

سرورِ عالمؐ کی یہی وہ عظیم حوصلگی ہے، جو اُنہیں انسانِ کامل اور نبیِ اکملؐ کا حق دار ٹھہراتی ہے۔ صحابہ کی یہی وہ اعلیٰ ظرفی اور اللہ کے دین کی حفاظت میں یہی وہ ثابت قدمی ہے، جس کا صلہ یہ ملا کہ عرب کے کفّار و یہود کا دس ہزار کا لشکرِ عظیم بزدلوں کی طرح خندق کے دہن عمیق کو جھانکتا رہا مگر اُسے پار کرنے کا اُس میں حوصلہ نہ ہُوا کہ ہمت و حوصلہ عطا کرنے والا تو اُس نبیِ اکملؐ اور اُن تین ہزار قدسیوں کے ساتھ تھا، جنہوں نے انسانی ہمت و حوصلہ کی آخری حد کو چھو لیا تھا۔

۵ھ کی آخری مہم بنو قریظہ کا مسلمانوں کی طرف سے محاصرہ ہے۔ معرکہ خندق میں بنو نضیر کے سردار حیی بن اخطب کے کہنے پر بنو قریظہ نے مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے معاہدہ امن کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے، کفّارِ مکہ اور بنو نضیر کا ساتھ دیا تھا، اب بنو نضیر کا سردار حیی بن اخطب اُن کے ساتھ تھا۔

واقعۂ خندق کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو لے کر بنو قریظہ کی طرف بڑھے۔ یہود کا یہ قبیلہ قلعہ بند ہو چکا تھا، حضرت علیؓ جب اُن کے قلعوں کی طرف بڑھے تو بنو قریظہ نے مصالحت کی کوشش کرنے کی بجائے حضورؐ کی شان میں گستاخانہ کلمات کہے

جس پر اُن کا محاصرہ کر لیا گیا اور یہ محاصرہ پچیس دن تک جاری رہا ۔[1] جس سے تنگ آ کر بنو قریظہ نے قبیلہ اُوس (جن سے اُن کے قدیمی تعلقات تھے) کے سردار حضرت سعدؓ بن معاذ کو ثالث مقرر کیا۔

حضرت سعد بنؓ معاذ نے تورات کے حکم کے مطابق فیصلہ دیا کہ "لڑنے والے قتل کئے جائیں، عورتیں اور بچے قید ہوں، مال و اسباب غنیمت قرار دیا جائے"۔ چنانچہ چار سے چھ سو تک مرد قتل کر دیئے گئے، جن میں بنو نضیر کا سردار حُیّی بن اخطب بھی شامل تھا، جس نے قریشِ مکہ و دیگر عرب قبائل کے کُفّار کو جنگِ خندق پر اُبھارا تھا، اور بنو قریظہ کو مسلمانوں سے معاہدۂ امن توڑنے پر مجبور کیا تھا۔

بنو قریظہ کے بارے میں اس فیصلے کو یورپی مؤرخین نے بے رحمانہ قرار دیا ہے، لیکن اِس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انصاف پسند طبیعت اور رحم دلانہ رویے سے چشم پوشی کرتے ہوئے، اپنا ثالث حضرت سعدؓ بن معاذ کو خود مقرر کیا تھا اور اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر نہیں رکھا کہ حضرت سعدؓ بن معاذ کا فیصلہ یہود کی مقدس کتاب تورات کے عین مطابق تھا ۔[2]

"جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لیے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے، اگر وہ صلح تسلیم کر لیں اور تیرے لیے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ موجود ہوں، سب تیرے غلام ہو جائیں گے، لیکن اگر صلح نہ کریں تو تُو اُن کا محاصرہ کر، اور جب تیرا خدا تجھ کو اُن پر قبضہ دلا دے، تو جس قدر مرد ہوں، سب کو قتل کر دے، باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں، سب تیرے لیے مالِ غنیمت ہوں گی"۔ (تورات کتاب تثنیہ، اصحاح ۲۰۔ آیت ۱۰)

---

[1] رحمۃ للعالمین جلد اوّل ص ۱۳۳

[2] سیرت النبی جلد اوّل ص ۴۴۵

بنو قریظہ کے خاتمے سے مدینہ کا گرد و نواح یہودیوں کے وجود سے پاک ہو گیا، کیونکہ بنی قینقاع شوال ۲ھ میں جلاوطن ہو کر شام کے علاقے اذرعات چلے گئے تھے۔ بنو نضیر ربیع الاول ۴ھ میں خیبر منتقل ہو چکے تھے اور اس طرح یہودیوں کی مسلسل فتنہ پردازیوں و فتنہ انگیزیوں سے مسلمانوں کو امن میسر آ گیا۔

۵ھ میں حضورؐ نے بحکم خداوندی جاہلیت کی ایک اور رسم توڑتے ہوئے اپنے متبنیٰ حضرت زیدؓ کی مطلقہ اپنی پھوپھیری بہن حضرت زینبؓ سے نکاح کر لیا۔ یہی وہ سال ہے، جس میں مسلمان عورتوں کو لباس اور سینے پر چادر ڈال کر باہر نکلنے کا حکم نازل ہوا، ساتھ ہی ساتھ نازو ادا سے چلنے اور غیر مردوں سے کھلاوٹ سے کلام کرنے پر منع کر دیا گیا۔ پانی نہ ملنے کی حالت میں تیمم کی مشروعیت اور نمازِ خوف بھی اسی سال کے حکم میں۔ زنا کی سزا سو کوڑے بھی اسی برس مقرر کی گئی اور "حدِ قذف" کا حکم بھی اسی سال نازل ہوا، گویا اسلام کا آئین تکمیل کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا۔

مدنی دور

۶ھ تا وصال

۶ھ کا سب سے اہم واقعہ صلح حدیبیہ ہے۔ سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ "حضورؐ نے رویا (خواب) میں دیکھا کہ مسلمان مسجدِ حرام میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس لیے ذیقعدہ ۶ھ کو مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور اِس خیال سے کہ کفار جنگ کا گمان نہ کریں، عمرہ کا احرام باندھا اور قربانی کے اونٹ ساتھ لیے۔"[1]

چودہ سو انصار و مہاجرین عمرہ کی نیت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ہوئے۔ ذوالحلیفہ (جو آج کل بیر علی کہلاتا اور مدینہ والوں کے لیے میقات ہے) پہنچ کر قربانی کی ابتدائی رسم ادا کی یعنی قربانی کے جانوروں کے گلے میں لوہے کے نعل ڈال دیئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کا ردِ عمل معلوم کرنے کے لیے قبیلہ خزاعہ کے ایک شخص کو پہلے بھیج دیا۔ اُس نے خبر دی کہ "قریش کو مسلمانوں کی مدینہ سے روانگی کی خبر مل چکی ہے۔ مسلمانوں کو روکنے کے لیے اُنہوں نے بہت سے قبائل کو جمع کر لیا ہے اور جنگ کی تیاری میں ہیں۔" اُدھر قریش نے خالد بن ولید کو جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے مع دو سو سواروں کے بطور ہراول دستے کے بھیج دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ چونکہ عمرے کی نیت سے مکہ جا رہے تھے، اِس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ "خالد کے دستے سے کترا کر داہنی طرف سے چلو۔"

---

[1] تاریخ الامت جلد اوّل ص ۱۵۸

خالد نے قریش کو یہ خبر پہنچائی کہ مسلمان غمیم تک پہنچ گئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آگے بڑھے اور حدیبیہ پہنچ کر قیام کیا۔ قبیلہ خزاعہ (جو مسلمانوں کا حلیف تھا) کے رئیس بدیل بن ورقاء کو قریش کی طرف یہ پیغام دے کر بھیجا کہ "ہم عمرہ کی غرض سے آئے ہیں، لڑنا مقصود نہیں۔ جنگ نے قریش کی حالت زار کر دی ہے اور اُن کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اُن کے لیے یہ بہتر ہے کہ ایک مدت معین کے لیے معاہدۂ صلح کر لیں اور مجھ کو عرب کے ہاتھ چھوڑ دیں۔ اِس پر اگر وہ راضی نہیں تو اُس خدا کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں یہاں تک لڑوں گا کہ میری گردن الگ ہو جائے اور خدا کو جو فیصلہ کرنا ہو کر دے"۔ [1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پیغام جب قریش کو پہنچا تو عروہ بن مسعود ثقفی، قریش کا جوابی پیغام لے کر آئے، لیکن سوائے بات چیت کے معاہدہ صلح پر بات آگے نہ بڑھی، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خراش رضی اللہ عنہ بن امیہ کو قریش کے پاس بھیجا۔ قریش نے انہیں قتل کر ڈالنا چاہا اور وہ اپنے قبیلے والوں کی مدد سے زندہ بچ آئے۔ مگر ساتھ ہی قریش نے ایک دستہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کو بھیج دیا، لیکن وہ لوگ گرفتار کر لیے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت عمرہ اور قریش سے معاہدۂ امن کی تھی، اِس لیے آپؐ نے اِس حملہ آور دستے کو معافی دے کر چھوڑ دیا۔

قریش سے صلح کی بات چیت کو آگے بڑھانے کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا، لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ "قریش میرے سخت دشمن ہیں اور مکہ میں میرے قبیلے کا ایک بھی شخص نہیں جو مجھ کو بچا سکے"۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے داماد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ قریش نے اُن کو روک لیا اور اِدھر یہ خبر پھیل گئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے۔

آپؐ کو جب یہ خبر ملی تو فرمایا کہ "عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا قصاص لینا فرض ہے"۔ آپؐ

---

[1] سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۴۶۲ - ۴۶۱

نے ببول کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہؓ سے جان نثاری کی بیعت لی۔ تمام صحابہؓ اور صحابیات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر جان نثاری کا عہد کیا اور یہی وہ بیعت ہے جو بیعتِ رضوان کہلاتی ہے اور قرآن نے سورۂ فتح میں اس کا بیان یوں کیا ہے۔

"خدا مسلمانوں سے راضی تھا، جب کہ وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ سو خدا نے جان لیا جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں تھا، تو خدا نے اُن پر تسلی نازل کی اور عاجلانہ فتح دی" (سورۂ فتح)

حضرت عثمان کی شہادت کی خبر درست نہ نکلی اور قریش نے شرائط صلح کے ساتھ انہیں سہیل بن عمرو کے ساتھ بھیج دیا۔ سہیل فصیح و بلیغ مقرر تھا۔ گفت و شنید کے بعد درج ذیل شرائط پر معاہدۂ صلح طے پایا۔

(۱) مسلمان اِس سال واپس چلے جائیں۔

(۲) اگلے سال آئیں اور صرف تین دن قیام کر کے چلے جائیں۔

(۳) ہتھیار لگا کر نہ آئیں۔ صرف تلوار ساتھ لائیں، وہ بھی نیام میں اور نیام جُلبّان (تھیلا) میں ہو۔

(۴) مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں، اُن میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے کوئی مکہ میں رہ جانا چاہے تو اُس کو نہ روکیں۔

(۵) قریش یا مکہ کے مقیم مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر یثرب (مدینہ) چلا جائے تو واپس کر دیا جائے گا، لیکن اگر مسلمان مکہ میں آ جائے گا، تو واپس نہیں کیا جائے گا۔

(۶) قبائلِ عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔

(۷) فریقین میں دس سال تک لڑائی نہ ہوگی اور باہم امن و امان کے ساتھ رہیں گے۔

یہ معاہدہ ابھی تحریر کیا جا رہا تھا کہ سہیل بن عمرو کے صاحبزادے، حضرت ابو جندل رضؓ، جو اسلام لا چکے تھے اور مکہ میں کفار کے زیرِ عتاب تھے، کسی طور بھاگ کر مسلمانوں کے پاس پہنچ گئے۔ حضورؐ نے سہیل سے کہا کہ ابو جندل کو یہیں رہنے دو مگر سہیل کسی طرح بھی راضی نہ ہوا۔

ابو جندل رضؓ نے مسلمانوں کو وہ زخم اور نشان دکھائے جو کفار کی مار سے اُن کے جسم پر پڑے ہوئے تھے۔ سہیل نے کہا "محمدؐ! صلح کی تعمیل کا یہ پہلا موقع ہے، اِس کو شرائطِ صلح کے مطابق، مجھے واپس دے دو!" حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا کہ معاہدے پر ابھی دستخط نہیں ہوئے تو جواباً سہیل نے کہا کہ تو پھر ہم کو صلح بھی منظور نہیں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ بڑی کشمکش کی حالت اور صحابہ کرام کے لیے کڑے امتحان کا موقع تھا اگرچہ معاہدے پر ابھی فریقین کے دستخط نہیں ہوئے تھے، لیکن زبانی طور پر معاہدہ طے پا چکا تھا اور اُس کی پاسداری ضروری تھی، اِدھر چودہ سو مسلمانوں کے سامنے اُن کا ایک مسلمان بھائی کفار کی رسیوں اور بیڑیوں میں جکڑا، ظلم و ستم کے زخم و نشان بطور ثبوت پیش کر رہا ہے اور اپنی نجات کے لیے فریاد کناں ہے اور کہہ رہا ہے۔ برادرانِ اسلام! کیا پھر مجھ کو اُسی حالت میں دیکھنا چاہتے ہو؟ میں اسلام لا چکا ہوں، کیا پھر مجھ کو کافروں کے ہاتھ دیتے ہو؟"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدے کی پاسداری کی اور ابو جندل کو اُس کے باپ کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا:

"ابو جندل! صبر و ضبط سے کام لو، خدا تمہارے لیے اور مظلوموں کے لیے کوئی راہ نکالے گا۔ صلح اب ہو چکی اور ہم ان لوگوں سے بدعہدی نہیں کر سکتے۔" (ابن ہشام)

سوائے حضرت عمر رضؓ کے صحابہ میں سے کسی نے بھی لب کشائی نہ کی، لیکن اِس واقعہ

نے انہیں دل تنگی کی اس حالت کو پہنچا دیا کہ قربانی کے لیے بھی کوئی نہ اٹھا، حتیٰ کہ حضورؐ نے پہلے خود قربانی کی اور بال منڈوالئے، تب صحابہ کرام کو یقین ہو گیا کہ حضورؐ اپنے فیصلے میں تبدیلی کرنے والے نہیں ہیں تو سب نے قربانی کی اور احرام اتار دیئے۔ حضرت عمرؓ اور حضورؐ میں جو گفتگو ہوئی، وہ کچھ اسی طرح ہے:

یا رسولؐ! کیا آپ پیغمبرِ برحق نہیں ہیں؟

آپؐ نے فرمایا۔ ہاں ہوں!

"تو ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں؟"

آپ نے فرمایا۔ "میں خدا کا پیغمبر ہوں اور خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا، خدا میری مدد کرے گا"

حضرت عمرؓ نے پوچھا "کیا آپؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ کعبہ کا طواف کریں گے؟"

آپؐ نے فرمایا "لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال کریں گے"

حضرت عمرؓ لاجواب ہو کر اٹھ گئے اور حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور وہ گفتگو دہرائی جو ان کے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین ہوئی تھی، تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا "وہ پیغمبرِ خدا ہیں، جو کچھ کرتے ہیں، خدا کے حکم سے کرتے ہیں" (صحیح بخاری)

صلح حدیبیہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن وہاں قیام فرمایا اور پھر مدینہ کی طرف لوٹے اور راستے میں سورۂ فتح اتری، جس کی پہلی آیت یوں ہے۔

(اے نبیؐ) ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی (سورۂ فتح)

"صلح حدیبیہ کے بعد جب فتح کا یہ مژدہ سنایا گیا تو لوگ حیران تھے کہ آخر اس صلح کو فتح کیسے کہا جا سکتا ہے۔ ایمان کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو مان لینے کی بات تو دوسری تھی، مگر اس کے فتح ہونے کا پہلو کسی کی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ آیت سن کر

پوچھا، یارسول اللہ! کیا یہ فتح ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہاں![1]

"اگرچہ اہلِ ایمان تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سن کر ہی مطمئن ہو گئے تھے، مگر کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ اس صلح کے فوائد ایک ایک کر کے کھلتے چلے گئے، یہاں تک کہ کسی کو بھی اِس امر میں شک نہ رہا کہ فی الواقع یہ صلح ایک عظیم الشان فتح تھی"۔[2]

(۱) اِس (صلح نامے) میں پہلی مرتبہ عرب میں اسلامی ریاست کا وجود باقاعدہ تسلیم کیا گیا اِس سے پہلے تک عربوں کی نگاہ میں محمدؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کی حیثیت محض قریش اور قبائلِ عرب کے خلاف خروج کرنے والے ایک گروہ کی تھی اور وہ ان کو برادری باہر (OUTLAW) سمجھتے تھے۔

(۲) مسلمانوں کے لیے زیارتِ بیت اللہ کا حق تسلیم کر کے قریش نے آپ سے آپ گویا یہ بھی مان لیا کہ اسلام کوئی بے دینی نہیں ہے، جیسا کہ وہ اب تک کہتے چلے آرہے تھے۔

(۳) دس سال کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ ہو جانے سے مسلمانوں کو امن میسر آگیا اور انہوں نے عرب کے تمام اطراف و نواح میں پھیل کر اِس تیزی سے اسلام کی اشاعت کی کہ صُلحِ حُدیبیہ سے پہلے پورے ۱۹ رسال میں اتنے آدمی مسلمان نہ ہوئے تھے، جتنے اس کے بعد دو سال کے اندر ہو گئے۔

(۴) قریش کی طرف سے جنگ بند ہو جانے کے بعد آنحضرتؐ کو یہ موقع مل گیا کہ اپنے مقبوضات میں اسلامی حکومت کو اچھی طرح مستحکم کر لیں اور اسلامی قانون کے اجراء سے مسلم معاشرے کو ایک مکمل تہذیب و تمدن بنادیں۔

(۵) قریش سے صلح کے بعد جنوب کی طرف سے اطمینان نصیب ہو جانے کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں نے شمالِ عرب اور وسطِ عرب کی تمام مخالف طاقتوں

---

[1] تفہیم القرآن جلد پنجم صـ ۳۴

[2] تفہیم القرآن جلد پنجم صـ ۴۰-۴۱

کو بآسانی مسخّر کرلیا۔

یہ تھیں وہ برکات جو مسلمانوں کو اِس صلح سے حاصل ہوئیں، جسے وہ اپنی ناکامی اور قریش اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے"۔ ؎۱

"اب تک اہلِ عرب اور خاص کر قریش، اسلام سے برسرِ پرخاش تھے، اِس صلح سے امن ہوگیا اور لوگوں کو مسلمانوں سے ملنے اور اسلام پر غور کرنے کا موقع ملا۔ نیز دعوتِ اسلام کے لیے راستہ صاف ہوگیا اور اہلِ اسلام بلاخوف وخطر قبائل میں آنے جانے لگے۔ آنحضرتؐ نے بادشاہوں، امراء اور رؤسا قبائل کے ساتھ مراسلت شروع کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ کثرت کے ساتھ اسلام لانے لگے اور مسلمانوں کی تعداد برابر بڑھنے لگی۔ اس لیے اس صُلح میں کفّار کے ساتھ جو خفیف رعایت برتی گئی اس کے مقابلہ میں اِس عظیم الشان نفع کا حاصل ہوجانا حقیقت میں فتح تھی"۔ ؎۲

"اب تک مسلمان اور کفّار ملتے جُلتے نہ تھے۔ اب صلح کی وجہ سے آمد ورفت شروع ہوئی۔ خاندانی اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے کُفّار مدینہ میں آتے، مہینوں قیام کرتے اور مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے۔ باتوں باتوں میں اسلامی مسائل کا تذکرہ آتا رہتا تھا۔ اِس کے ساتھ ہر مسلمان اخلاص، حسنِ عمل، نیکوکاری، پاکیزہ اخلاقی کی ایک زندہ تصویر تھا، جو مسلمان مکہ جاتے تھے، اُن کی صورتیں بھی مناظر پیش کرتی تھیں۔ اِس سے خود بخود کُفّار کے دل اسلام کی طرف کھچتے آتے تھے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اِس معاہدہ صلح سے لے کر فتح مکہ تک اِس قدر کثرت سے لوگ اسلام لائے کہ کبھی نہیں لائے تھے۔ حضرت خالدؓ (فاتح شام) اور حضرت عمروؓ بن عاص (فاتح مصر) کا اسلام بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے"۔ ؎۳

؎۱ تفہیم القرآن جلد پنجم ص۴۱-۴۰

؎۲ تاریخ الاُمت جلد اوّل ص۶۵-۱۶۴

؎۳ سیرت النبی جلد اوّل ص۴۷۱-۴۷۰

گو صلح حُدیبیہ بظاہر دب کر ہوئی تھی، لیکن خدا نے اِس کو فتح سے تعبیر کیا اور سورۂ إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۔ نازل ہوئی کہ نتائج کے اعتبار سے یہ صلح درحقیقت فتح کا دیباچہ تھی، صلح سے پہلے مسلمانوں کافروں سے الگ تھلگ رہتے تھے، اس کے بعد دونوں میں میل جول اور آمد و رفت شروع ہوئی، ہر مسلمان اسلام کی سچی تصویر تھا، اِس تصویر کو دیکھ کر اور تبادلہ خیالات سے کفّار کے دل خود بخود اسلام کی طرف کھنچنے لگے اور اسلام نہایت سرعت کے ساتھ پھیلنے لگا۔ چنانچہ صلح حُدیبیہ سے لے کر فتح مکہ تک جس کثرت سے کفّار اسلام میں داخل ہوئے اتنے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے"۔[1]

یہ ہیں وہ دلائل جو ہمارے ذی علم حضرات نے صلح حُدیبیہ کو کھلی ہوئی فتح قرار دینے کے لیے پیش کیے ہیں، اور جو واقعی بڑے وزنی دلائل ہیں۔ نتائج جو انہوں نے اخذ کیے ہیں، وہ بھی خوب ہیں مگر یہ سب کچھ مابعد کے نتائج کو مدِنظر رکھ کر مُرتّب کیا گیا ہے، کیونکہ اُس وقت تو یہ سب نتائج ایک سربستہ راز تھے، جب صلح حُدیبیہ کے بارے میں سورۂ فتح کی پہلی آیت "ہم نے تجھ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی" نازل ہوئی تھی اور اِسی سربستہ راز کو جاننے کے لیے حضرت عمرؓ سے جلیلُ القدر صحابی نے حضورؐ سے شاید کسی قدر تشکک سے پوچھا تھا کہ "یا رسول اللہؐ! کیا یہ فتح ہے؟" اور حضورؐ نے فرمایا تھا "ہاں"۔

یہی وہ سربستہ راز تھا جس کو نہ جانتے ہوئے ایک اور صحابی نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ "یہ کیسی فتح ہے؟ ہم بیتُ اللہ جانے سے روک دیئے گئے، ہماری قربانی کے اونٹ بھی آگے نہ جا سکے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حُدیبیہ ہی میں رُک جانا پڑا، اور اِس صلح کی بدولت ہمارے دو مظلوم بھائیوں (ابو جندل اور ابو بصیر) کو ظالموں کے حوالہ کر دیا گیا"۔[2]

---

[1] تاریخ اسلام جلد اوّل ص ۶
[2] تفہیم القرآن جلد پنجم ص ۳۴

راز کی جو بات اللہ نے اپنے رسولؐ کے دل میں ڈال دی تھی، اُسے اور کون جان سکتا تھا، مگر کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ اِس صلح کا فتح ہونا، بالکل عیاں ہوتا چلا گیا اور ہر خاص و عام پر یہ بات پوری طرح کھل گئی کہ فی الواقع اسلام کی فتح کا آغاز صلح حُدیبیہ ہی سے ہُوا تھا'' [1]

معاہدہ حُدیبیہ کی سبھی شرائط بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھیں، خصوصاً شرط ۵ کہ'' قریش یا مکہ کے مقیم مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر یثرب (مدینہ) چلا جائے، تو واپس کر دیا جائے گا، لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں آجائے گا تو واپس نہیں کیا جائے گا'' مسلمانوں کے سخت خلاف تھی۔ مگر یہی وہ شرط ہے، جو قریش از خود واپس لینے پر مجبور ہو گئے۔ تفصیل اِس اجمال کی یوں ہے کہ معاہدہ حُدیبیہ کے بعد سب سے پہلے حضرت ابو بصیرؓ بھاگ کر مدینہ آئے تو قریش نے اپنے دو آدمی اُنہیں پکڑ لانے کو بھیجے۔ حضورؐ نے ابو بصیرؓ کو اُن کے ساتھ جانے کو کہا۔ حضرت ابو بصیرؓ نے ذو الحلیفہ پہنچ کر اُن میں سے ایک شخص کو قتل کر ڈالا، اور دوسرا شخص جان بچا کر مدینہ بھاگ آیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابو بصیرؓ کی شکایت کی۔ حضرت ابو بصیرؓ بھی واپس چلے آئے تھے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ'' آپؐ نے عہد کے مطابق مجھ کو واپس کر دیا تھا، اب آپؐ پر کوئی ذمہ داری نہیں''۔ یہ کہہ کر وہ مدینہ سے چلے گئے اور مقام عیص پر جو سمندر کے کنارے ہے رہنے لگے۔ مکہ کے ستم رسیدہ مسلمانوں کو ابو بصیرؓ کی پناہ گاہ سے متعلق جب معلوم ہُوا، تو وہ مکہ کے ظالموں و سفاکوں سے جان بچا بچا کر اِس ٹھکانے پر آنے لگے اور جلد ہی مکہ سے بھاگے ہوئے مسلمانوں کی ایک خاص تعداد جمع ہو گئی اور اپنی گزر بسر کے لیے قریش کے شام کو جاتے تجارتی قافلوں پر حملے کرنے لگی۔ قریش ابو بصیر اور اُن کے ساتھیوں کے حملوں سے تنگ آ گئے اور حضورؐ کو لکھ بھیجا کہ'' معاہدے کی یہ شرط ہم واپس لیتے

---

[1] تفہیم القرآن جلد پنجم صـ ۴۳

ہیں، اب جو مسلمان چاہے مدینہ جا کر آباد ہو سکتا ہے، ہم اُس سے تعرض نہ کریں گے"
چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بصیر اور اُن کے ساتھیوں کو مدینہ بلا لیا اور قریش کے
کاروانِ تجارت اُن کی دست برد سے محفوظ ہو گئے۔

معاہدہ حُدیبیہ کی شرائط کے سربستہ رازوں میں سے یہ پہلا راز تھا جو مسلمانوں پر
کھلا کہ بظاہر سخت اور کڑی نظر آنے والی شرائط، خود قریش ہی کے خلاف ہیں، جو اس
معاہدے کو اپنی فتح خیال کئے ہوئے ہیں۔ جوں جوں دن گزرتے چلے گئے ایسے سربستہ راز کھلتے چلے گئے کہ
معاہدہ حُدیبیہ درحقیقت قریشِ مکہ کی شکست اور مسلمانوں کی فتح مبین کا آغاز تھا۔
اللہ نے اپنے نبیؐ کو حُدیبیہ سے لوٹتے وقت فتح کی جو خوشخبری دی تھی، اُس میں ذرہ
برابر بھی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ مسلمان اِس خوش خبری سے حیران ہوئے
تھے تو اس بنا پر کہ یہ ایک ایسا راز تھا، جو اُن کے نبیؐ پر تو کھول دیا گیا تھا، لیکن اُن
پر کھلنا باقی تھا، جو کچھ وقت بعد قریشِ مکہ کے اپنی سب کڑی شرط از خود واپس لینے
پر کھلنا شروع ہو گیا، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رازکی یہ بات اُن پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔

سنہ ۶ھ میں صلح حُدیبیہ کے بعد حضورؐ کو جب قدرے اطمینان نصیب ہوا۔ تو
آپؐ نے اپنے اُس مقصدِ اعلیٰ کی طرف توجہ فرمائی، جس کے لیے آپؐ کو مبعوث فرمایا
گیا تھا، یعنی اسلام کی تبلیغ و اشاعت، تبلیغِ دین کو مکہ و مدینہ تک محدود رکھنا آپؐ کا
مقصد و نصب العین نہ تھا۔ اسلام کی اشاعت تو دنیا بھر اور ساری ہی نوعِ انسان
کے لیے تھی، لیکن قریباً انیس برس گزر جانے کے باوجود اسلام کی تبلیغ صرف عرب
بلکہ عرب کے ایک چھوٹے سے حصے تک محدود رہی تھی۔ کفارِ مکہ نے مسلمانوں کی
ہجرت کے بعد بھی اسلام کی بیخ کنی اور مسلمانوں کی تباہی و بربادی میں کوئی کسی اُٹھا نہ
رکھی تھی بقول مولانا مودودی مرحوم مسلمان اب تک برادری باہر (OUTLAW) کی سی
حیثیت رکھتے تھے۔ جان و مال و دین کی حفاظت ہی اُن کے لیے ایک بڑا مسئلہ بنا
رہا تھا۔ صلح حُدیبیہ (جسے اکثر و بیشتر مسلمان اپنی شکست اور قریشِ مکہ اپنی فتح خیال
کئے ہوئے تھے) کے بعد مسلمانوں کو پہلی بار یہ اطمینان نصیب ہُوا کہ اب دس برس تک

اُنہیں سب سے بڑے فریقِ مخالف سے کسی جنگ کا سامنا نہیں ہے۔ اِس دل جمعی کے نصیب ہوتے ہی حضورؐ نے بلاتاخیر عرب کے قرب وجوار کے امراء اور اُس وقت کے معروف بادشاہوں اور شہنشاہوں کو قبولِ اسلام کے لیے پیغام بھیجے جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

حضورؐ کے سفیر یا نامہ بر	مکتوب الیہ
۱۔ حضرت دحیہؓ کلبی	قیصرِ روم
۲۔ حضرت عبداللہؓ بن حذافہ سہمی	خسرو پرویز کجکلاہ ایران
۳۔ حضرت حاطبؓ بن بلتعہ	عزیزِ مصر
۴۔ حضرت عمروؓ بن امیہ	نجاشی شاہ حبش
۵۔ حضرت سلیطؓ بن عمر بن عبدشمس	رؤسائے یمامہ
۶۔ حضرت شجاعؓ بن وہب الاسدی	رئیس حدودِ شام، حارث غسانی [1]

حضرت دحیہؓ کلبی نے حضورؐ کا گرامی نامہ، حارث غسانی کو دیا۔ قیصرِ روم اُس زمانے میں ایرانیوں کو شکست دینے کے بعد شکرانہ ادا کرنے بیت المقدس آیا ہوا تھا، اِس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خط اُسے وہیں بھیج دیا گیا۔ قیصرِ روم نے خط پاکر، دربار میں مکہ کے کسی شخص کو طلب کیا۔ ابوسفیان، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جانی دشمن اور کفّار کا سالارِ اعظم اُن دنوں بسلسلہ تجارت غزّہ آیا ہوا تھا، سو اُسے غزّہ سے لایا گیا۔ اُس کے ساتھ کچھ اور عرب بھی دربار میں حاضر کئے گئے ہوں گے۔ حضورؐ کے سفیر جناب دحیہؓ کلبی بھی دربار میں تھے، سو اُن کی موجودگی میں ابوسفیان سے قیصرِ روم نے حضورؐ سے متعلق کچھ سوالات کئے اور ابوسفیان سچ سچ جواب دینے پر مجبور تھا، تاکہ دربار میں موجود کوئی دوسرا عرب اُس کی تردید نہ کردے اور جھوٹ بولنے پر قیصرِ روم کا عتاب

---

[1] سیرت النبی جلد اوّل ص ۴۷۵

اُس پر نازل ہو۔

سوالات و جوابات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شریف النسب و صادق اور اقرار کا پکا ہونا ثابت ہو گیا، اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ حضورؐ کے پیروکار امرائے عرب نہیں، بلکہ اکثر و بیشتر غربا و کمزور لوگ ہیں، جن کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ لڑائیوں میں کبھی حضورؐ اور اُن کے پیرو غالب رہے ہیں اور کبھی کفارِ مکہ۔ اُن کے دین سے متعلق یہ بھی قیصر روم کو معلوم ہو گیا کہ آپؐ توحید کی تعلیم دیتے ہیں، کسی کو خدا کا شریک نہیں ٹھہراتے، نماز پڑھنے، سچ بولنے، پاک رہنے، عزیزوں اور رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرنے کو کہتے ہیں۔

ابوسفیان کے جوابات سُن کر قیصر روم نے کہا۔ "پیغمبر ہمیشہ شریف خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں، اُن کے اولین پیرو غریب ہوتے ہیں، اور اُن کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے اور پھر جو شخص عام آدمیوں سے فریب نہیں کرتا اور جھوٹ نہیں بولتا، وہ خدا سے متعلق کیونکر جھوٹ بول سکتا ہے، اس کے ساتھ وہ نماز پڑھنے، سچ بولنے، پاک رہنے کی ہدایت بھی کرتا ہے تو وہ ضرور اللہ کا پیغمبر ہے اور اُس کا قبضہ یہاں تک ہو جائے گا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں ظاہر ہو گا، اگر میں اُس تک پہنچ سکتا تو اُس کے قدم دھوتا۔

خسرو پرویز شہنشاہِ ایران کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کا انداز اِس لیے پسند نہ آیا کہ اُس کا آغاز اللہ کے پاک نام سے کیا گیا تھا، اُس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی تھا، اور پھر کسریٰ فارس کا نام، ناموں کا یہی تاخر و تقدم تھا جو مزاجِ شاہی کو سخت ناگوار گزرا، اور نامۂ مبارک کے چاک کرنے کا سبب بنا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ نامۂ رسولؐ کو نہیں بلکہ اپنے اور اپنی قوم کے نامۂ مقدر کو چاک چاک کر رہا ہے۔ گستاخی کے اس واقعہ کو زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اُس کے بیٹے شیرویہ نے باپ کا رشتۂ حیات چاک کر ڈالا اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں عظیم ایرانی سلطنت چاک چاک ہو گئی، اور اُسے وہ عروج آج تک حاصل نہ ہوا، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے زمانۂ رسالت میں تھا۔

عزیزِ مصر مُقوقس نے دعوتِ اسلام کو قبول نہ کی، لیکن آپؐ کے نامہ بر حضرت حاطبؓ بن بلتعہ سے عزت و احترام سے پیش آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور تحفہ دو قبطی لڑکیاں، کچھ کپڑا اور سواری کے لیے ایک خچّر بھیجا۔ لڑکیوں میں سے ایک حضرت ماریہ قبطیہؓ، حضورؐ کے نکاح میں آئیں۔

نجاشی، شاہ حبش سب سے زیادہ سعادت مند ثابت ہُوا کہ اُس نے حضورؐ کے نامۂ مبارک وصول ہونے پر، حضرت جعفر طیارؓ کو بلا بھیجا، جو ہجرت حبشہ کے زمانہ سے حبش میں موجود تھے اور اُن کے ہاتھ پر بیعتِ اسلام کی، اور اُسی نے حضرت اُم حبیبہؓ سے غائبانہ حضورؐ کا نکاح پڑھوایا اور خود چار سو اشرفیاں مہر ادا کیا، اور حضورؐ کی خدمت میں اُنہیں مدینہ روانہ کر دیا۔

اِن کے علاوہ کچھ اور خطوط بھی تھے، جو تبلیغِ اسلام کے سلسلے میں روسائے عرب کو لکھے گئے، جن کے مختلف جواب آئے۔ بہر طور یہ پہلا موقعہ تھا کہ اسلام کا پیغام حدودِ عرب سے باہر نکلا اور دنیا نے جان لیا کہ وہ عظیم نبیؐ جس کی آمد کی خبر مختلف انبیاء اپنے اپنے زمانے میں دیتے آئے تھے آ گیا ہے۔

اِسی برس دو ایسے حضرات نے اسلام قبول کیا، جن کے نام نامی اسلام کے عظیم سپہ سالاروں کی صفِ اوّل میں آتے ہیں۔ پہلے خالد بن ولید، فاتحِ شام، جن کے سبب مسلمانوں کو معرکۂ اُحد میں شدید جانی نقصان اُٹھانا پڑا تھا، اور دوسرے عمرو بن العاص جو فاتحِ مصر کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

۷ھ کا سب سے اہم واقعہ فتح خیبر اور یہودیوں کے فتنہ و فساد کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہے۔ ۵ھ میں غزوۂ احزاب (خندق) کے بعد مسلمانوں نے بد عہدی کی بنا پر یہودیوں کے قبیلے بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا تھا اور یہودیوں کے مقرر کردہ ثالث حضرت سعدؓ بن معاذ کے فیصلے کے مطابق مدینے سے اُن کا خاتمہ ہو گیا اور یہود کی مسلسل فتنہ انگیزیوں سے مسلمانوں کو امن میسر آ گیا تھا، مگر مدینہ سے قریبًا دو سو میل

دورِ خیبر یہودیوں کا بہت بڑا گڑھ تھا۔ یہاں نخلستان کے گردونواح میں یہودی آباد تھے۔ بنو نضیر ۴ھ میں مع اپنے مال و اسباب کے مدینہ سے نکل کر خیبر چلے آئے تھے اور یہیں آباد ہو گئے تھے۔

یہود ہمیشہ کفارِ مکہ اور دیگر غیر مسلم عرب قبائل کو مدینہ کے مسلمانوں کے خلاف جنگ پر اُبھارتے آئے تھے۔ ۵ھ میں غزوۂ خندق جس کا بہت بڑا ثبوت ہے، گو اس کا خمیازہ بنو قریظہ نے بھگتا بھی لیکن اِس کے باوجود وہ اپنی سازشوں سے باز نہ آئے تھے۔ اُن کا سردار حیی بن اخطب، بنو قریظہ کے محاصرے کے نتیجے میں قتل ہو چکا تھا جس کی جگہ سلام بن ابی الحقیق نے لے لی تھی اور اپنے متصل بسنے والے ایک بڑے قبیلے غطفان کو ۶ھ میں اِس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ مدینہ پر حملہ کیا جائے۔ اِس خبر پر ایک انصاری عبداللہؓ بن عتیک نے خیبر جا کر سلام کو قتل کر دیا تھا۔ سلام کے بعد اُسیر بن رزام یہودیوں کا سردار بنا اور اُس نے خیبر اور اُس کے گردونواح میں بسنے والے یہودیوں کو اکٹھا کر کے کہا "میرے پیشرووں نے محمدؐ کے مقابلے میں جو تدبیریں اختیار کی تھیں وہ غلط تھیں، صحیح تدبیر یہ ہے کہ خود محمدؐ کے دارالریاست پر حملہ کیا جائے اور میں یہی طریقہ اختیار کروں گا"

اُسیر کی جنگی تیاریوں کی سُن گُن لینے کے لیے عبداللہؓ بن رواحہ کو خیبر بھیجا گیا، جنہوں نے حالات معلوم کئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائے۔ آپؐ نے مصالحت کے ذریعے اس فتنے کو دبانے کی کوشش کی اور عبداللہؓ بن رواحہ کو مع تیس ساتھیوں کے اُسیر کو مدینہ لانے کے لیے بھیجا۔ اُسیر بھی تیس ساتھیوں کو لیے مسلمانوں کے ساتھ مدینہ روانہ ہوا، لیکن راستے میں قرقرہ کے مقام پر اُسیر کے دل میں بدگمانی پیدا ہوئی اور اُس نے عبداللہؓ بن انیس کی تلوار چھیننا چاہی، جس پر انہوں نے اُسیر پر وار کیا، جس سے اُس کی ران کٹ گئی، اُس نے بھی جوابًا عبداللہؓ بن انیس کو زخمی کر دیا۔ یہ واقعہ فریقین میں جھڑپ کا سبب بنا، جس کے نتیجے میں سوائے ایک کے سب یہودی مارے گئے[1]

---

[1] سیرت النبی جلد اوّل ص ۴۹۰-۴۸۹ و تاریخ اسلام حصہ اوّل ص ۶۳

یہ وہ واقعات تھے جو غزوۂ خیبر کے اسباب بنے۔ ان میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ مدینہ کے منافقین خصوصاً عبداللہ بن اُبی درپردہ یہودیوں کے ساتھ تھا اور وہ بھی اُنہیں جنگ پر اُبھارتا رہتا تھا۔ اِس کا ایک فوری سبب یہ بھی تھا کہ قبیلہ غطفان کے چند آدمیوں نے ذی قرد کی چراگاہ پر چھاپہ مارا، اور اُس میں چرنے والی حضورؐ کی چند اونٹنیوں کو پکڑ کر لے گئے اور حضرت ابو ذرؓ کے صاحبزادے کو جو اُن کی حفاظت پر متعین تھا، قتل کر دیا اور اُن کی بیوی کو گرفتار کر کے لے گئے۔ حضرت سلمہؓ بن الاکوع کو سب سے پہلے اِس چھاپے کی خبر ملی، وہ مشہور تیر انداز تھے، اُنہوں نے حملہ آوروں کو جالیا اور اِس سرعت سے تیر برسائے کہ حملہ آور بھاگ گئے اور حضورؐ کی اونٹنیاں چھڑا لائے۔

اِن حالات میں یہ ضروری ہو گیا تھا کہ غطفان اور یہودِ خیبر کے حملے سے مدینہ کو بچایا جائے اور خود آگے بڑھ کر اِس فتنے کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ محرم ۷ھ کو حضورؐ سولہ سو صحابہ کو ساتھ لے کر (جن میں دو سو سوار اور باقی پیدل تھے) خیبر کی طرف بڑھے۔ آپؐ نے رجیع کے مقام کو مُستقر بنایا، جو کہ قبیلہ غطفان اور خیبر کے درمیان تھا، تاکہ غطفان آسانی سے اہلِ خیبر کی مدد کو نہ پہنچ سکیں۔ یہود کے حلیف ہونے کے سبب غطفان آگے بڑھے لیکن انہوں نے جب یہ دیکھا کہ وہ خطرے میں ہیں تو واپس چلے گئے۔

اسبابِ بار برداری اور چند مستورات جو ساتھ تھیں، مُستقر پر چھوڑ کر مسلمان خیبر کی طرف بڑھے۔ خیبر چھ چھوٹے چھوٹے قلعوں۔ ناعم، قموص، نطاۃ، قصارۃ، شق اور مربطہ پر مشتمل تھا۔ ان سب میں قموص مضبوط اور محفوظ قلعہ تھا، جس کا سردار مرحب تھا، جو عرب کا مانا ہوا پہلوان تھا۔

مسلمان مجاہد شام کے قریب خیبر کے نواح میں پہنچ گئے۔ رات وہیں بسر کی اور صبح خیبر پہنچے۔ سب سے پہلے مجاہد ناعم کی طرف بڑھے اور حضرت محمودؓ بن مسلمہ نے مع ساتھیوں کے حملہ کیا اور دلیری سے لڑے۔ لڑائی کے وقفے میں وہ قلعہ کی فصیل کے

سائے ستانے کو بیٹھ گئے، ایک یہودی کنانہ بن الربیع نے چکی کا پاٹ اُن کے سر پر گرا دیا، جس سے وہ شہید ہو گئے، لیکن قلعہ جلد ہی فتح ہو گیا۔ ناعم کے بعد دوسرے قلعے بھی کسی خاص دشواری کے بغیر فتح ہو گئے، لیکن قموص کو فتح کرنے کے لیے بڑے بڑے صحابہ کو سپہ سالار بنایا گیا مگر فتح نہ ہُوا۔ ایک شام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "کل میں اُس شخص کو عَلَم دوں گا، جس کے ہاتھ پہ خدا فتح دے گا، اور جو خدا اور خدا کے رسول کو چاہتا ہے، خدا اور خدا کا رسول بھی اُس کو چاہتے ہیں"۔[1]

صبح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو پکارا، جو اُس وقت آشوبِ چشم میں مبتلا اور جنگ سے معذور تھے۔ حضرت علیؓ حاضر ہوئے تو حضورؐ نے لعابِ دہن اُن کی آنکھوں میں لگایا، دعا فرمائی اور عَلَم عطا فرمایا۔

یہود کا نامی گرامی پہلوان مرحب قلعہ سے یہ رجز پڑھتا ہُوا نکلا

خیبر جانتا ہوں کہ میں مرحب ہوں
دلیر، تجربہ کار، سلحہ پوش ہوں

مرحب کے رجز کے جواب میں جنابِ علیؓ نے رجز پڑھا:

میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام شیر رکھا ہے
میں شیرِ ببر کی طرح سخت حملہ آور ہوں

مرحب بڑے غرور سے آگے بڑھا۔ حضرت علیؓ نے اِس زور کا وار کیا کہ تلوار اُس کے سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اُتر آئی۔ اپنے عظیم پہلوان کے مارے جانے پر یہود نے عام حملہ کیا، لیکن شکست کھائی اور اِس طرح یہ مضبوط قلعہ بھی بیس دن کے محاصرے کے بعد فتح ہو گیا۔ اِن سب چھوٹے بڑے قلعوں کو فتح کرنے میں ترانوے ۹۳ یہود مارے گئے اور پندرہ صحابہ کرامؓ نے شہادت پائی۔ فتح کے بعد مفتوحہ زمین پر قبضہ کر لیا گیا، لیکن یہود نے جب یہ درخواست کی کہ زمین ہمارے قبضے میں رہنے دی جائے اور ہم پیداوار کا نصف حصّہ ادا کریں گے، تو آپؐ نے درخواست منظور

---

[1] صحیح بخاری بحوالہ سیرت النبی جلد اوّل ص۵۰۰

فرمائی۔

حضرت صفیہؓ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کے بارے میں بعض سیرت اور کتبِ حدیث میں یہ درج ہے کہ پہلے وہ جناب دحیہ کلبیؓ کو دی گئیں، لیکن جب آپؐ نے اُن کے حسنِ سیرت وصورت کی تعریف سنی تو اُنہیں واپس لے کر معاوضے میں جناب دحیہ کلبیؓ کو سات لونڈیاں دیں۔ مخالفینِ اسلام نے اِس روایت کو خوب نمک مرچ لگا کر بدنما پیرائے میں پیش کیا ہے، حالانکہ واقعہ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ فتح خیبر کے بعد قیدی جب اکٹھے کئے گئے تو حضرت دحیہ کلبیؓ نے حضورؐ سے ایک لونڈی کے لیے درخواست کی اور آپؐ نے اُنہیں اختیار دیا کہ خود جا کر کوئی سی بھی لونڈی لے لیں۔ اُنہوں نے حضرت صفیہؓ کو پسند کیا، لیکن جب کچھ لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ وہ قریظہ اور نضیر کی رئیسہ ہیں اور آپؐ کے سوا کوئی بھی اُن کے لائق نہیں، تو آپؐ نے حضرت صفیہؓ کو آزاد کر کے اُن سے نکاح کر لیا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی کہ بعض سیرت نگار اِس پر حاشیہ آرائی کرتے، کیونکہ اِس سے قبل غزوۂ بنی المصطلق میں بھی ایسا ہی واقعہ پیش آ چکا تھا، جس میں رئیس قبیلہ کی بیٹی حضرت جویریہؓ سے حضورؐ کے نکاح کرنے پر بنی المصطلق کے تمام افراد جو لونڈی، غلام بنا لیے گئے تھے، اِس بنا پر آزاد کر دیئے گئے تھے کہ اِس قبیلے کی اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت داری ہو گئی تھی۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ مسلمان تاریخ اور سیرت نگار ہی ہیں، جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کثرتِ ازواج وغیرہ پر ضعیف اور غلط روایات کو نقل کر ڈالا ہے، جن پر یورپی عیسائی مؤرخین نے حاشیہ آرائی کر کے نہایت ہی غلط انداز اور نازیبا الفاظ میں پیش کیا ہے۔ ماضی کے یہ مسلمان مؤرخ اور سیرت نگار اگر احتیاط سے کام لیتے اور خوب چھان پھٹک کر روایات نقل کرتے تو عیسائی مؤرخین اور سوانح نگاروں کو وہ مسالا ڈھونڈ ہاتھ ہی نہ آتا، جسے بنیاد بنا کر اُنہوں نے حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر زبان درازی کی ہے۔ یہاں یہ کہنا مقصود نہیں کہ ماضی کے مسلم مؤرخ و

وسیرت نگار محقق نہ تھے یا فنِ تاریخ نویسی وسیرت نگاری سے نابلد تھے۔ انہوں نے کیا یہ کہ حضورؐ سے متعلق جو بھی روایت کہیں سے بھی ملی درج کر دی، شاید اس لیے کہ وہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی سے متعلق ہے، لیکن یہ دیکھنے اور پرکھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ ان کے راوی کون ہیں اور کس معیار کے ہیں۔ بہر طور یہ اپنوں ہی کا کیا دھرا ہے، جس نے عیسائیوں کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے متعلق دریدہ دہنی اور زہر چکانی کی بنیاد فراہم کی اور جس کا جواب اب تک مسلمان دیتے آئے ہیں اور دے رہے ہیں۔

اسی برس حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے وہ عمرہ ادا کیا، جس سے گزشتہ برس کفارِ مکہ نے انہیں روک دیا تھا اور وہ حدیبیہ سے لوٹ آئے تھے۔ اس عمرہ میں کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا، سوائے اس کے روسائے قریش تین دن کے لیے مکہ سے باہر چلے گئے اور کچھ کفار نے بیتُ اللہ کے سامنے واقع کوہِ ابو قبیس پر ڈیرے ڈال دیئے اور وہیں سے مسلمانوں کو عمرہ ادا کرتے دیکھتے رہے۔ کفارِ مکہ نےچونکہ یہ مشہور کر رکھا تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ کی آب وہوا نے کمزور کر دیا ہے، اس لیے اسی عمرے میں کعبہ کے طواف کے پہلے تین چکروں میں مسلمانوں کو رمل کرنے یعنی اکڑ کر چلنے کو کہا گیا کہ مسلمانوں کی صحت کی کمزوری سے متعلق کفارِ مکہ نے جو افواہ پھیلا رکھی ہے، مسلمانوں کی صحت وتندرستی کے ثبوتِ ظاہری سے وہ غلط ثابت ہو جائے۔ سنتِ ابراہیمی میں حضورؐ کی یہ وہ سنت ہے جو آج تک جاری وساری ہے کہ حاجی آج بھی کعبہ کے طواف کے پہلے تین چکروں میں رمل کرتا ہے۔

آئینِ اسلامی میں اس برس کچھ اور اضافہ ہوا یعنی اُمتِ مُسلمہ پر پنجہ دار پرندے، درندے، گدھا اور خچر وغیرہ کا کھانا حرام قرار دے دیا گیا۔ لونڈیاں جو غیر مسلموں، عرب قبائل اور یہودیوں وغیرہ سے جھڑپوں میں ہاتھ آتی تھیں۔ اُن سے تمتع جائز تھا۔ اب یہ تمتع ایک ماہ کے بعد جائز قرار پایا اور اگر لونڈی حاملہ ہو، تو وضع حمل کے بعد۔

۸ھ جمادی الاولیٰ میں حضورؐ نے حارثؓ بن عمیر کا قصاص لینے کے لیے شرجیل بن عمرو غسانی کے علاقے بلقا کی طرف تین ہزار صحابہ کو روانہ کیا، کیونکہ اُس نے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ بر حضرت حارث رضؓ کو قتل کر دیا تھا۔ جو اس عیسائی عرب کی طرف دعوتِ اسلام لے کر گئے تھے۔ مجاہدین کی سپہ سالاری حضرت زید رضؓ بن حارثہ کو ملی، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ مجاہدین کو روانہ کرتے وقت حضورؐ نے فرمایا "اگر وہ شہید ہو جائیں تو جعفر رضؓ بن ابی طالب اُن کی جگہ لیں اور اگر وہ بھی شہادت پائیں تو عبداللہ رضؓ بن رواحہ سپہ سالار کے فرائض سرانجام دیں۔

شرجیل بن عمرو غسّانی نے مسلمانوں کی آمد کی خبر پاکر قریباً ایک لاکھ فوج جمع کی، اُس زمانے میں قیصر روم ہرقل شام کے مقام مآب میں ایک عظیم فوج کے ساتھ خیمہ زن تھا ایک لاکھ باقاعدہ مسلّح فوج اور تین ہزار نیم مسلّح مجاہدین کا کیا مقابلہ تھا، چنانچہ اس جھڑپ میں پہلے حضرت زید رضؓ پھر حضرت جعفر رضؓ اور پھر حضرت عبداللہ رضؓ بن رواحہ یکے بعد دیگرے شہید ہوئے اور اُن کے بعد اسلامی پرچم حضرت خالد رضؓ بن ولید نے سنبھالا، جو صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لا چکے تھے، اور اِس بہادری سے لڑے کے یکے بعد دیگرے آٹھ تلواریں اُن کے ہاتھ میں ٹوٹیں اور اُنھوں نے اِس معرکے میں معاملہ فہمی اور جنگی مہارت کا پورا پورا ثبوت دیا، اور تین ہزار مجاہدین کے نیم مسلّح لشکر کو کمال فوجی مہارت سے لڑاتے لڑاتے پیچھے ہٹا لائے اور اِس طرح مسلمانوں کا یہ لشکر کامل تباہی سے بچ گیا۔

اِس معرکے میں صرف بارہ مسلمان شہید ہوئے[1] لیکن جب یہ لشکر مدینہ پہنچا تو اکثر اہلِ شہر نے اُسے شکست خوردہ اور فراری کہا۔ درحقیقت تین ہزار مجاہدین کا یہ اسلامی لشکر اگر فتح یاب نہ تھا، تو شکست خوردہ بھی نہ تھا کہ حضرت خالد رضؓ بن ولید کی جنگی بصارت وبصیرت اُسے شکست سے بچا لائی تھی۔ وہ فراری یوں نہیں تھے کہ دشمن کے مقابلے میں پیٹھ پھیر کر نہیں بھاگے تھے۔ اُن کے تین سپہ سالار بڑی بہادری و جواں مردی سے لڑتے میدانِ جنگ میں شہید ہوئے تھے اور چوتھا سپہ سالار ایک لاکھ کی عظیم فوج کے مقابلے کی تاب نہ رکھتے ہوئے کمال دوراندیشی اور جنگی بصیرت کے

---

[1] تاریخ الامت جلد اوّل ص ۱۶۹

پلیشِ نظر انہیں دشمنوں کے نرغے سے نکال لایا تھا۔

یہی وہی خالدؓ بن ولید ہیں، جن کی جنگی چال کی بنا پر معرکۂ اُحد میں مسلمانوں کو شکست کا سامنا ہوا تھا۔ اسلام کی کشش و صداقت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضانِ نظر کا کمال ملاحظہ ہو کہ اس معرکۂ موتہ میں اُن کی جنگی بصارت و بصیرت نے تین ہزار مجاہدین کے لشکر کو مکمل تباہی و بربادی سے بچالیا۔ یہ بات وثوق سے کہی جا جاسکتی ہے کہ معرکۂ موتہ میں حضرت زیدؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت عبداللہؓ کی یکے بعد دیگرے شہادتوں کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید اگر اسلامی مجاہدین کے سپہ سالار نہ ہوتے، تو تین ہزار مسلم مجاہدین کو ایک لاکھ دشمن سپاہ کے ہاتھوں معرکۂ اُحد یا اُس سے بھی بڑی شکست کا سامنا ہوتا۔

بہر طور یہ ناکام معرکہ جہاں حضرت خالدؓ بن ولید کی سپہ سالارانہ صلاحیتوں کو عیاں کرتا ہے، وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ لڑائی جو موتہ کے مقام پر لڑی گئی، مسلمانوں کے لیے ایک شدید صدمہ تھی اور حضورؐ کے لیے بھی کہ اُن کے تین پیارے حضرت زیدؓ، حضرت عبداللہؓ اور اُن کے چچازاد بھائی حضرت جعفرؓ اس میں شہید ہوئے تھے۔

۸ ھ ۱۰ ار رمضان المبارک (یکم جنوری ۶۳۰ء) وہ یادگار اور تاریخ ساز دن ہے، جب حضورؐ اللہ کے پاک گھر کو بتوں کی آلائش سے پاک کرنے کے لیے مکہ کی طرف بڑھے، کیونکہ قریشِ مکہ نے از خود معاہدہ حُدیبیہ توڑ دیا۔ ہوا یہ تھا کہ صلح حُدیبیہ کے بعد قبیلہ خزاعہ، حضورؐ کا حلیف ہو گیا، جب کہ بنو بکر قریش کے ساتھ ہو گئے تھے کہ وہ خزاعہ کے دشمن چلے آتے تھے۔ بنو بکر نے پرانا انتقام لینے کے لیے خزاعہ پر حملہ کر دیا۔ قریش نے نہ صرف یہ کہ اُن کی مدد کی بلکہ اُن کے کچھ سرداران نے لڑائی میں بھی بنو بکر کا ساتھ دیا۔ خزاعہ اُن کے حملے کی تاب نہ لا کر حرم میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے مگر بنو بکر کے سردار نوفل نے حدودِ حرم کا احترام بھی ملحوظ نہ رکھا اور وہاں بھی اُن کا خون بہایا، چنانچہ خزاعہ کے چالیس ناقہ سوار اعانت کے لیے مدینہ حاضر ہوئے اور سارے حالات بیان کیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے حلیف قبیلے کے اس طرح بے دریغ تہ تیغ

کئے جانے کا از حد صدمہ ہوا، اور انہوں نے قریش کے پاس اپنا قاصد بھیجا، جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے انہیں تین شرائط پیش کیں۔

(۱) خزاعہ کے مقتولوں کا خون بہا دیا جائے۔

(۲) قریش مکہ، بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

(۳) یا پھر یہ اعلان کر دیا جائے کہ معاہدۂ حدیبیہ ٹوٹ گیا۔

قریش نے تیسری شرط منظور کر لی، لیکن بعد میں انہیں معاہدۂ حدیبیہ کے توڑ ڈالنے کا شدت سے احساس ہوا۔ اور انہوں نے اس کی تجدید کروانا چاہی اور اس سلسلے میں اُن کا سردار ابوسفیان، مدینہ میں گیا، لیکن حضورؐ معاہدے کی تجدید پر راضی نہ ہوئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریشِ مکہ پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں اور اتحادی قبائل کو تیار ہو کر آنے کو کہا۔ چنانچہ ۱۰ رمضان ۸ھ کو حضور دس ہزار صحابہ کو ہم رکاب لے کر مکے کی طرف بڑھے۔ یہ سب کچھ قریش کی لاعلمی میں ہوا۔ یہاں تک کہ مکہ سے ایک منزل سے بھی کم فاصلے مرّ الظہران پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ کیا، اور حضورؐ نے صحابہ کو میدان میں پھیل جانے اور الگ الگ آگ روشن کرنے کو کہا۔ اب قریش کو یہ خبر مل گئی کہ مسلمانوں کا عظیم لشکر سر پر پہنچ چکا ہے، چنانچہ حکیم بن حزام، ابوسفیان اور بدیل بن ورقاء کو صورت حال معلوم کرنے کو بھیجا۔ جب یہ لوگ خیمۂ نبوی کی طرف بڑھے تو حضرت عمرؓ نے ابوسفیان کو دیکھ لیا اور تیزی سے آگے بڑھے کہ حضورؐ سے اجازت لے کر اس دشمنِ اسلام کو ختم کر دیں مگر حضرت عباسؓ نے جو اُن کے ساتھ تھے اُن کی جان بخشی کی درخواست کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوسفیان کو امان دی اور رات بھر حضرت عباسؓ کے خیمے میں رہے اور صبح اسلام لے آئے۔

مؤرخین صبح کو جب مکہ کی طرف بڑھے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکرِ اسلام کا نظارہ کرنے کے لیے ابوسفیان کو حضرت عباسؓ کے ساتھ ایک اونچی جگہ پر بھیج دیا۔ اسلامی لشکر کے مختلف قبائل جب تکبیر کے نعرے بلند کرتے ہوئے یکے بعد

دیکھے گزرے تو ابوسفیان پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ آج اسلامی لشکر کا مقابلہ ناممکن ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ ابوسفیان نے اُس دن گو اسلام قبول کر لیا، مگر صرف دکھاوے کا تھا، لیکن بعد کو وہ سچے مسلمان بن گئے، چنانچہ غزوۂ طائف اور جنگ یرموک میں وہ شامل ہوئے۔

مکہ پہنچ کر آپ نے حکم دیا کہ علم نبوی مقام حجون پر نصب کیا جائے۔ آپؐ بالائی اور حضرت خالدؓ زیریں حصے سے مکہ میں داخل ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان کروا دیا کہ "جو شخص ہتھیار ڈال دے گا، یا ابوسفیان کے گھر پناہ لے گا یا اپنے گھر کا دروازہ بند کرے گا یا خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے گا، اُس کو امن دیا جائے گا!" لیکن اِس فراخ دلی کے باوجود بھی قریش کے ایک گروہ نے حضرت خالدؓ کے دستوں پر تیر برسائے۔ جس سے تین صحابی حضرت کرزؓ بن جابر، حضرت حُبیشؓ بن اشعر اور حضرت سلمہؓ بن المیلاء نے شہادت پائی۔ حضرت خالد دفاع پر مجبور ہوئے اور قریش تیرہ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ آپ نے اس بارے میں حضرت خالدؓ سے باز پرس بھی کی اور جب یہ معلوم ہوا کہ ابتدا قریش مکہ نے کی تھی تو فرمایا "قضائے الٰہی یہی تھی!"۔ فتح مکہ میں یہی معمولی سی جھڑپ تھی جو قریشِ مکہ اور مسلمانوں کے مابین ہوئی، جس میں تین مسلمان شہید ہوئے اور تیرہ کفّار ہلاک۔

خانہ خدا کی حالت یہ تھی کہ تین سو ساٹھ بُتوں سے بھر رکھا تھا۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ سب کو کعبہ سے نکال دیا جائے اور دیواروں پر جو تصاویر ہیں، مٹا دی جائیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے کعبہ کی اندرونی دیواروں سے تصاویر مٹا دیں اور بت کعبہ سے نکال پھینکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت بلالؓ اور حضرت طلحہؓ کے ساتھ کعبہ میں داخل ہوئے اور تکبیریں کہیں اور باہر تشریف لا کر قریش سے یوں مخاطب ہوئے:

"ایک اللہ کے سوا، اور کوئی اللہ نہیں ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اُس نے اپنا وعدہ سچا کیا۔ اُس نے اپنے بندے کی مدد کی اور تمام

جنھوں کو تنہا چھوڑ دیا۔ ہاں تمام مفاخر، تمام انتقامات تمام خون بہا، سب میرے قدموں کے نیچے ہیں، صرف حرمِ کعبہ کی تولیت اور حجاج کی آب رسانی اِس سے مستثنیٰ ہیں۔ اے قومِ قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار اللہ نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم سے مٹی سے بنے ہیں۔" [1]

آج وہ دن ہے کہ مسلمان اُس شہر میں فاتحانہ داخل ہوئے تھے، جہاں سے چھپ کر، ڈر کر، بے یار و مددگار اور ذلیل و خوار ہو کر نکلے تھے۔ اِسی شہر میں وہ لوگ بھی موجود تھے، جنہوں نے اُن پر انتہائی ظلم و ستم روا رکھا۔ دینِ اسلام سے منحرف کرنے کو سبّ و شتم، زد و کوب، ذلت و خواری کا ہر حربہ اُن پر آزمایا تھا۔ ان ہی مسلمانوں میں وہ رہبرِ کامل، ہادیٔ برحق، مکے کا امین و صادق بھی شامل ہے، جو سب سے زیادہ ظلم رسیدہ اور ستم چشیدہ تھا کہ وہی سب سے بڑا اُن کا خارِ نگاہ تھا۔

آج تو ظالموں سے بدلہ چکانے اور انہیں لونڈی غلام بنا کر بے دروے گھر کر دینے کا دن تھا، جیسا کہ مسلمانوں سے اُنھوں نے کیا تھا۔ آج تو اُنہیں تختۂ دار پر کھینچ دینے کا دن تھا، جو ہجرت کی رات نبیِ برحقؐ کو قتل کرنے کو تلواریں سونتے اُن کے دروازے پر کھڑے تھے۔

آج وہ جبارانِ قریش گردنیں جھکائے خطبہ سن رہے تھے، جنہوں نے اسلام کو مٹانے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تہ تیغ کرنے میں کوئی بھی کسر باقی نہ چھوڑی تھی۔ اِن میں وہ بھی تھے جن کے ہاتھ بدر و اُحد میں مسلمانوں کے خون سے رنگین ہوئے تھے۔ اِن میں وہ بھی موجود تھے، جنہوں نے قبائل عرب، یہودِ مدینہ و خیبر کو ساتھ ملا کر جنگِ احزاب (خندق) میں پوری تیاری سے مدینے پر حملہ کیا تھا کہ مدینے کے مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹا دیں۔ اِن میں وہ بھی حاضر تھے، جنہوں نے صلح نامہ

---

[1] سیرت النبی جلد اوّل ص ۵۳۳

معاہدہ حدیبیہ میں یہ شرط رکھی تھی کہ کوئی مسلمان اگر مکہ سے مدینہ جائے گا تو واپس کر دیا جائے گا۔ ان میں وہ بھی گھٹنوں میں سر دیے کے بیٹھے تھے، جنہوں نے مفلس و نادار مسلمانوں کو جلتے پتھروں اور تپتی ریت پر لٹایا تھا۔

آج ان میں ہر ایک اس بات کا سزاوار تھا کہ اُسے سزائے موت دی جائے اور اُن کے بیوی بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا جائے اور اُن کے گھر بار کو کھنڈر بنا دیا جائے جیسا کہ اکثر فاتح کرتے آئے تھے، لیکن جب آپؐ نے خطبۂ فتح کے بعد سخت لہجے میں مخاطب ہوتے ہوئے قریش سے پوچھا "تم کو کچھ معلوم ہے کہ میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟" تو مجمع سے بہت سے پکار اُٹھے۔

"آپؐ سخی و مہربان بھائی ہیں، اور سخی و مہربان بھائی کے بیٹے ہیں۔"

وہ جسے سخی و مہربان کہا گیا تھا، وہ جس کی رگوں میں حضرت ابراہیمؑ سے سخی و مہربان کا خون جناب اسماعیلؑ اور جناب عبداللہ کی وساطت سے دوڑ رہا تھا، وہ واقعی سخی و مہربان نکلا اور آج اُس نے سخاوت و مہربانی کی انتہا کر دی، جس کی مثال پیش کرنے کو تاریخِ عالم کسی بھی فاتح کی نشان دہی نہیں کر سکتی۔ اُس نے اپنا فیصلہ یہ سنایا کہ۔

"تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔"

کُفارِ مکہ نے مسلمانوں کے مدینہ ہجرت کر جانے پر اُن کے مکانوں اور جائدادوں پر قبضہ کر لیا تھا اور آج وہ دن تھا کہ مسلمانوں کے متروکہ مکان، مال و اسباب وغیرہ واپس دلائے جائیں، مگر آپؐ نے اس معاملے میں بھی انتہائی سیر چشمی اور سخاوت کا ثبوت دیا اور صحابہ سے کہا کہ وہ اپنی متروکہ جائدادوں سے دست بردار ہو جائیں۔

مشرق و مغرب کا کوئی بھی تاریخ دان یہ تو بتائے کہ کیا تاریخِ عالم میں کوئی فاتح ایسا بھی گزرا ہے، جسے شہر بدر کیا گیا ہو، اور پھر وہ آبائی شہر فتح کرنے کے بعد، دشمنوں سے انتقام لینے کی بجائے، دشمنوں کے زیرِ تصرف اپنی اور اپنے پیروکاروں کی جائدادیں

سے بھی دست بردار ہوگیا ہو؟ جس نے اپنے اور اپنے پیروکاروں کے خون کے پیاسوں سے یہ کہا ہو کہ "تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو!"

مکہ فتح ہوگیا، نہ وہ روم کی طرح جل کر کھنڈر بنا، نہ پرسی پولس کی طرح راکھ کا ڈھیر بنا، نہ یورشلم کی طرح اُس کی اینٹ سے اینٹ بجی، نہ بغداد کی طرح اُس میں انسانی کھوپڑیوں کے مینار بنے اور نہ دہلی کی طرح اُس میں قتلِ عام ہُوا، کچھ بھی نہ ہُوا، اور سب کچھ ہُوا بھی کہ وہ جو رحمتِ عالم بن کر آیا تھا، رحمت کا بادل بن کر برس گیا، جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ "کُفّار نے اِس ترحم اور مہربانی کو دیکھ کر اسلام کی طرف قدم بڑھایا اور ایک قلیل تعداد کے سوا، جو بعد میں اسلام لائی، تمام اہلِ قریش اُسی دن مسلمان ہو گئے۔ چند کافر جنہوں نے خاص جرائم کئے تھے قتل کئے گئے"۔[1]

لیکن تعجب وحیرانی کی بات تو یہ ہے کہ ان ناقابلِ تردید حقائق کے باوجود بھی دریدہ دہن عیسائی و یہودی مؤرخین یہ یاوہ گوئی کرتے ہیں کہ محمدؐ بے رحم و منتقم مزاج تھے اور انہوں نے اسلام کو بزورِ شمشیر پھیلایا۔

مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے قریشِ مکہ کے اسلام لانے کے واقعہ کو یوں بیان کیا ہے کہ "مقامِ صفا میں آپؐ ایک بلند مقام پر بیٹھے، جو لوگ اسلام قبول کرنے آتے تھے، آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے۔ مردوں کی باری ہو چکی تو مستورات آئیں۔ عورتوں سے بیعت لینے کا یہ طریقہ تھا کہ ان سے ارکانِ اسلام اور محاسنِ اخلاق کا اقرار لیا جاتا تھا، پھر پانی کے ایک لبریز پیالہ میں آنحضرتؐ دستِ مبارک ڈبو کر نکال لیتے تھے۔ آپؐ کے بعد عورتیں اِسی پیالہ میں ہاتھ ڈالتی تھیں اور بیعت کا معاہدہ پختہ ہو جاتا تھا۔ اُن مستورات میں ہند بھی آئی۔ یہ وہی ہند ہے جو رئیس العرب عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہؓ کی ماں تھی، حضرت حمزہؓ کو اُسی نے قتل کرایا تھا اور اُن کا سینہ چاک کر کے کلیجہ چبا گئی تھی"۔[2]

---

[1] تاریخ الاُمت جلد اوّل صفحہ ۱۷۵

[2] سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۵۳۶

ابوسفیان کی بیوی ہندیا ہندا سے بڑا مجرم اور کون ہو سکتا تھا مگر آج اُس نے بھی امان پائی کہ اللہ کا نبی، رحمۃٌ للعالمین تھا اور وہ نیک و بد، پر رحمت کا بادل بن کر یکساں برسا۔ اِس بلند حوصلگی، عالی ظرفی اور سیر چشمی کا مظاہرہ تاریخ عالم میں کسی بھی فاتح سے منسوب نہیں، سوائے سرورِ دو عالمؐ کے کہ وہ صرف فاتح نہ تھے، نہ ہی اُن کا مقصدِ حیات شہروں اور ملکوں کو فتح کرنا تھا، جیسا کہ بعض مسلم تاریخ نویسوں اور سیرت نگاروں اور اکثر و بیشتر عیسائی مؤرخین نے ظاہر کیا ہے۔

آقائے نامدارؐ کو صرف فاتح ہی نہیں رحمۃٌ للعالمین بھی بنا کر بھیجا گیا تھا اور یہ اُن کی کریمی، رحیمی، انسان دوستی اور امن پروری کا بیّن ثبوت ہے کہ مکہ میں بسنے والوں کی عزت و ناموس، جان و مال سبھی کچھ سلامت رہا اور یہ انسان دوستی اور امن پروری کا نتیجہ تھا کہ جبّاران و مُتمرّدانِ قریش جوق در جوق اسلام لے آئے تھے، اُن پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا تھا۔

مقامِ صد افسوس ہے کہ اِن روشن دلائل پر بھی عیسائی مؤرخین بضد ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، لیکن بر عکس اِس کے حقیقت یہ ہے کہ اسلام جب بھی پھیلا اور جہاں بھی پھیلا تلوار کے نیام ہو جانے پر پھیلا ہے۔ چاہے وہ مدینہ ہو یا مکہ، سندھ ہو یا ہند۔ سبب اُس کا حضورؐ کے نام لیوا تھے، جو دینِ اسلام کے صحیح معنوں میں پیروکار تھے۔

یہ درست ہے کہ قرونِ اولیٰ کے سے اللہ کے احکام کے پابند اور رسولؐ کی محبت سے سرشار مسلمانوں کا میسّر آنا خاصا دشوار ہے، لیکن مسلمانوں کے اِس عملی انحطاط کے سبب دینِ اسلام پر حرف زنی اور بانیِ اسلام پر حرف گیری قرینِ انصاف نہیں، لیکن متعصّب عیسائیوں، متمرّد یہودیوں اور ذات پات کے بندھوں میں جکڑے ہندوؤں سے انصاف کی توقع بھی اک امرِ محال ہے۔ یورپی عیسائیوں میں بعض مؤرخ ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے تعصّب کی پٹی ہٹا کر جب اسلام اور پیغمبرِ اسلام کو دیکھا ہے، تو ایسا ہی پایا ہے جیسا کہ حقیقت میں وہ

ہیں اور اس حقیقتِ کاملہ کا اظہار انہوں نے برملا اپنی تحریروں میں بھی کیا ہے مگر فرزندانِ تثلیث اور پیروانِ سبلٹ نے اپنے زورِ تحریر سے اُسے دبانے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔

مکہ کے فتح ہو جانے کے بعد عرب کے مختلف قبائل نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا، کیونکہ قریش جو کعبہ کے متولی اور اسلام کے سب سے بڑے دشمن تھے، اسلام قبول کر رہے تھے، لیکن ہوازن اور ثقیف کے قبیلے جو فنونِ حرب سے خوب واقف تھے، یہ خدشہ محسوس کرنے لگے کہ اب مسلمانوں کا رخ اُن کی طرف ہوگا۔ اِس سے پہلے کہ وہ حملہ کریں، ہم اُن پر ٹوٹ پڑیں۔

حضورؐ کو ہوازن اور ثقیف کی جنگی تیاریوں کی جب خبر ملی تو آپؐ نے تصدیق کے لیے حضرت عبداللہؓ بن ابی حدرد کو بطور جاسوس کے بھیجا اور انہوں نے اُن کی جنگی تیاریوں کو بچشمِ خود دیکھا اور حضورؐ سے سب کچھ جا بیان کیا، چنانچہ آپ نے مقابلے کی تیاری شروع کی۔ جس کے لیے آپؐ نے صفوان بن امیہؓ (جو مکہ کے روساء میں سے تھا، لیکن ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا) سے کچھ اسلحہ جنگ ادھار لیا اور شوال ۸ھ کو بارہ ہزار انصار، مہاجرین مع مکہ کے نو مسلمانوں وغیرہ کے دشمن کی طرف بڑھے۔

حُنین میں اُحد کی سی صورتِ حال کا سامنا ہوا کہ شروع میں کفّار شکست کھا کر پیچھے ہٹے اور مسلمان مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑے تو کفّار نے انہیں تیروں پر رکھ لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان شکست کھا کر بھاگنے لگے۔ بعض نے مسلمانوں کے بھاگنے کا سبب مکہ کے اُن مشرکین، منافقین اور نو مسلموں کو بتایا ہے۔ جو اِس جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔ یہاں بھی معرکۂ اُحد کی طرح ایک بار پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے رہ گئے۔ آپؐ نے انصار کو پکارا تو وہ لبیک کہتے ہوئے آپ کی طرف بڑھے، پھر آپؐ نے حضرت عباسؓ کو بلند آواز سے مہاجرین اور انصار کو پکارنے کے لیے کہا تو سبھی پلٹ پڑے اور اِس طرح بازی پلٹ گئی۔

مسلمان نہ صرف شکست سے بچ گئے بلکہ اُن کی جاں نثاری نے شکست کو فتح میں بدل دیا۔ ثقیف کے کچھ لوگ جم کر لڑے، لیکن ان کا عَلَم بردار عثمان بن عبداللہ جب مارا گیا تو وہ بھی بھاگ نکلے۔ قرآن نے سورۂ توبہ میں اِس معرکے کا حال مختصراً یوں بیان کیا ہے:

"اللہ نے بہت سے موقوں پر تمہاری مدد کی اور حُنین کے دن بھی جب تم کو اپنی کثرت پر ناز تھا، حالانکہ وہ کچھ کام نہ آئی اور زمین باوجود اپنی وسعت کے تمہارے اوپر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگے، پھر اللہ نے اپنے رسول اور مسلمانوں پر تسلّی نازل کی اور وہ فوجیں اُتاریں، جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کو سزا دی اور کافروں کا بدلا یہی ہے۔" (سورۂ توبہ)

یہ پہلا موقع تھا، جب مسلمانوں کو کثرت نصیب ہوئی تھی۔ صُلح حُدیبیہ تک مسلمان ایک مغلوب فریق تھے اور وہ صرف اِس کوشش میں رہے کہ کسی طور اپنی جان و مال اور دین کو کفّار اور یہود سے بچائے رکھیں۔ صلح حُدیبیہ کے بعد اُنہیں سکھ کا سانس لینے اور نت نئی فتنہ سامانیاں، شرانگیزیاں اور ریشہ دوانیاں کرنے والے یہود کو مغلوب کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ فتح مکہ گویا پہلا قدم تھا مسلمانوں کا عروج کی طرف۔ اللہ کا یہ فضلِ خاص تھا کہ مکہ کے کفّار نے بغیر لڑے بھڑے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور جن چند جوشیلے نوجوانوں نے لڑنے کی کوشش کی تھی وہ جلد ہی مغلوب ہو گئے تھے۔

شاید فتحِ مکہ کا غرور ہی تھا، جو مسلمانوں کے سر میں سمایا تھا۔ اِس واقعہ کو قریباً ایک ماہ ہی گزرا تھا کہ حنین کا معرکہ اُنہیں پیش آگیا اور اُن کا اپنی کثرت پر نازاں ہو جانا کوئی غیر طبعی بات نہ تھی، لیکن اللہ تو اُنہیں ہمیشہ کے لیے یہ سبق سکھانا چاہتا تھا کہ فتح و شکست کثرت سے نہیں، اللہ کے فضل و کرم اور پھر اُس کی راہ میں پوری طرح قدم جما دینے سے حاصل ہوتی ہے اور شاید اُحد والے سبق کا اِعادہ مقصود تھا کہ مسلمان کا مقصود

تو اعلائے کلمۃ الحق ہے نہ کہ مالِ غنیمت کہ مالِ غنیمت کی ہوس ہی تو اُحد میں مسلمانوں کی شکست کا سبب بنی تھی اور یہاں حنین میں بھی یہی ہوسِ مال وزر ہی تھی، جو اُن کے آڑے آئی تھی، وہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور چند صحابہ کی ثابت قدمی تھی، جس نے حنین میں مسلمانوں کو شکست سے بچالیا اور فتح سے ہمکنار کیا، ورنہ مکہ کے نو مسلموں، مشرکین و کفّار کے ساتھ ساتھ جس طرح مہاجر و انصار ﷺ پھیر کر بھاگے تھے، کفّار کے ہاتھوں حنین میں شکستِ فاش سے دوچار ہوتے بلکہ یہ بھی بعید نہ تھا کہ مکہ بھی اُن کے ہاتھوں سے جاتا رہتا اور مکہ کے وہ مشرک و کفّار جو مسلمانوں کے ساتھی بن کر اس معرکے میں شریک ہوئے تھے اُن ہی کے خلاف پھر سے ہتھیار اُٹھا لیتے اور مسلمان مدینہ تک پسپا ہوتے چلے جاتے اور اس طرح مسلمان جس تباہی و بربادی سے دوچار ہوتے اُس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔

معرکۂ حنین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انسانِ کامل ہونے کا ایک اور واضح اور بیّن ثبوت ہے کہ جب مکہ کے قریباً دو ہزار کفّار و مشرکین اور نو مسلم، ہوازن والوں کی تیر اندازی سے گھبرا کر بھاگے اور اُن کے ساتھ مسلمانوں کے پاؤں بھی اکھڑ گئے تو اللہ کا رسول ﷺ جلالِ نبوت میں پکارتا ہے "میں خدا کا بندہ اور اس کا پیغمبر ہوں"، یعنی اپنے پیغمبر ہونے کا اظہار تو کیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات کا اقرار بھی کیا کہ میں اللہ کا غلام ہوں اور غلام کسی طور بھی آقا کی راہ سے سرتابی نہیں کر سکتا۔ انسانِ کامل وہی ہے، جو ہر حالت اور ہر حال میں اُس مقصد (مشن) پر ڈٹا رہتا ہے، جو اُس کے سپرد ہوتا ہے یا کیا جاتا ہے، ورنہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ میدانِ جنگ سے سپہ سالار اور بادشاہ فوج کے ساتھ پسپا ہوئے اور بھاگے بھی ہیں اور جو اپنے مقصد کے لیے ڈٹے رہے، وہ میدانِ جنگ میں مارے بھی گئے ہیں۔

معرکۂ بدر و حنین میں نظر نہ آنے والی فوجیں اُتارے جانے کا جو تذکرہ قرآن میں ہے، ہم مسلمانوں کا اُس پر ایمانِ کامل ہے، لیکن یورپ کے عیسائی و یہود اور ہمارے یہاں کے مغرب زدہ مسلمان اس پر کیونکر یقین کرنے لگے۔ ان دونوں معرکوں کی تاریخ بہ

بتاتی ہے کہ بدر میں تعداد، اسلحہ اور جنگی مہارت غرض کہ ہر پہلو سے کمزور ہوتے ہوئے بھی مسلمان فتح یاب ہوئے، اور حُنین میں شکست کھا کر بھاگے ہوئے مسلمان اپنے نبیؐ کی پکار پر جب پلٹ پڑے تو شکست فتح میں بدل گئی تھی۔ ان دونوں معرکوں میں مسلمانوں کی فتح مُحیّر العقول نظر آتی ہے اور یہی مُحیّرُ العُقول واقعات ہیں، جن میں مشیّتِ ایزدی کام کر رہی ہوتی ہے اور اِسی کا نام "نظر نہ آنے والی خدائی فوج" ہے۔

حُنین کا معرکہ سر ہو چکا، اُس میں مالِ غنیمت جو ہاتھ لگا، اُس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

(۱) چھ ہزار اسیرانِ جنگ۔

(۲) چوبیس ہزار اونٹ۔

(۳) چالیس ہزار سے زیادہ بکریاں۔

(۴) چار ہزار اوقیہ چاندی۔[۱]

اسیرانِ جنگ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن جناب شیماؓ بھی تھیں، جو اپنے دعویٰ کی تصدیق کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائی گئیں تو انہوں نے پیٹھ پر وہ نشان حضورؐ کو دکھایا، جہاں ایامِ رضاعت میں آپؐ نے دانت سے کاٹا تھا۔ سرکارؐ نے اپنی چادر اُن کے لیے بچھائی، اُن کی دلجوئی کی اور اُنہیں پیش کش کی کہ وہ چاہیں تو اُن کے ساتھ رہیں اور اگر گھر جانا چاہیں تو اُنہیں وہاں پہنچا دیا جائے۔ اُنھوں نے گھر جانا پسند فرمایا اور سرکارؐ نے کچھ اونٹ اور بکریاں اُن کے ساتھ بھجوا دیں۔ رحمۃٌ للعالمین تو تھے ہی صفاتِ عالیہ کا مجموعہ لیکن یہ بات خاص تھی کہ عزیز و اقارب اور وہ لوگ جنہوں نے کبھی بھی اُن سے حسنِ سلوک روا رکھا تھا، اُن کا از حد احترام کرتے اور اُن سے ہمیشہ نیک اور فراخ دلانہ سلوک فرماتے تھے۔

حُنین سے بھاگے ہوئے کفّار طائف میں جا پناہ گزین ہوئے۔ طائف کے گرد

---

[۱] سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۵۴

شہر پناہ تھی، جس کی حفاظت پر اہلِ شہر اور حُنین کی شکست خوردہ فوج متعین ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیرانِ جنگ اور مالِ غنیمت کو جعرانہ بھیج دیا، اور خود طائف کی طرف بڑھے۔ بیس دن طائف کا محاصرہ رہا، اہلِ شہر نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، محاصرے کو طول کھینچتا دیکھ کر حضورؐ نے صحابہ کے مشورے سے محاصرہ اُٹھا لیا اور جعرانہ چلے آئے۔

جعرانہ میں ہوازن کے کچھ لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہوازن وہی قبیلہ ہے، جس سے جنابِ حلیمہ سعدیہ تھیں اور جنہوں نے اسی قبیلے میں آپؐ کی رضاعت کی تھی۔ ہوازن کے وفد نے آپؐ سے کہا "یا رسول اللہ! ہم آپ کے رشتہ دار اور قرابت مند ہیں۔ آپؐ کی رضائی والدہ حلیمہ ہمارے ہی قبیلہ کی تھیں، اگر ملوکِ عرب مثلاً نعمان بن منذر یا حارث غسّانی وغیرہ میں سے کسی نے ہمارے خاندان میں دودھ پیا ہوتا تو ہم کو اُن سے بہت کچھ اُمیدیں ہوتیں، اور آپؐ کی ذات سے تو ہم اُن سے بھی زیادہ توقع رکھتے ہیں، جو عورتیں اس جنگ میں گرفتار ہو کر آئی ہیں، اِن میں سے بہت سی آپؐ کی خالائیں اور پھوپھیاں ہیں"۔

آپؐ نے فرمایا تم کو اپنا مال زیادہ عزیز ہے یا عیال۔ اُن لوگوں نے کہا "اِن دونوں میں سے ہم اپنے عیال کو ترجیح دیتے ہیں"۔ فرمایا کہ "میرے اور بنی عبدالمطلب کے حصہ میں جس قدر تمہارے عیال آئے ہیں، میں تم کو واپس کر دوں گا، لیکن بہتر یہ ہے کہ جس وقت میں ظہر کی نماز سے فارغ ہوں، اُس وقت تم لوگ جماعت کے سامنے میرا واسطہ دلا کر مسلمانوں سے اپنے عیال کو مانگو"۔ اُنہوں نے ایسا ہی کیا۔ آنحضرتؐ نے سب کے سامنے اعلان کیا کہ "عبدالمطلب کی اولاد کے حصّہ میں جس قدر تمہارے بال بچے ہیں، اُن کو میں نے تمہیں بخشا"۔ یہ سُن کر سارے مسلمان بول اُٹھے کہ "جس قدر اِن کے اہل و عیال ہمارے حصّہ میں آئے ہیں، وہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے"۔ اِس طرح ہوازن کو اُن کے اہل و عیال واپس مل گئے۔[1]

---

[1] تاریخ الامّت جلد اوّل ص ۱۷۹-۱۷۸

"احسان کا بدلہ احسان" جس خوش تدبیری سے آپؐ نے چکایا، وہ نہ صرف قابلِ صد تحسین ہے، بلکہ آپؐ کی صفاتِ عالیہ کا مظہر بھی۔ آپؐ کے صحابہؓ نے جس ایثار سے کام لیا، وہ بھی قابلِ صد تعریف ہے کہ نبی کے فعل کی مطابقت ہی اصل ایمان ہے۔ آپ کی یہی صلہ رحمی اور رحم دلی تھی جو ہر جگہ اور ہر موقعہ پر کارفرما رہی اور آپؐ کا انہی صفاتِ حسنہ کا نتیجہ تھا کہ مکہ ایک عظیم خون خرابے سے بچا رہا اور اسلام کے شدید مخالف اور آپ کے جانی دشمن بھی اسلام لے آئے۔ اِسی صلہ رحمی سے آپؐ نے حُنین کے مالِ غنیمت کی تقسیم میں بھی کام لیا، اور اسلام کے سب سے بڑے مخالف اور اپنے جانی دشمن ابوسفیان اور اُس کی اولاد کو تین[3] سو اُونٹ اور ایک سو[1] بیس اوقیہ چاندی ملی اور اسی طرح دوسرے مخالفینِ اسلام کو جن میں سے اکثر ایمان لے آئے تھے مالِ غنیمت میں سے بڑے بڑے حصے دیئے گئے اور یہ سب اہلِ مکہ اور نو مسلم تھے۔ اس پر انصار کو ملال ہوا، اور اُن میں سے بعض نے کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو انعام دیا اور ہم کو محروم رکھا، حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک قریش کے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں۔" بعض بولے کہ ہر مشکلات میں ہماری یاد ہوتی ہے اور غنیمت اوروں کو ملتی ہے۔"[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چرچے سُنے تو انصار کو طلب فرمایا اور پوچھا کہ تم نے ایسا کہا ہے؟ لوگوں نے عرض کی "حضور صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے سربرآوردہ لوگوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا۔ نوخیز نوجوانوں نے یہ فقرے کہے تھے۔" آپؐ اِس پر انصار سے یوں مخاطب ہوئے۔

> "کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم کو ہدایت کی؟ تم منتشر اور پراگندہ تھے خدا نے میرے ذریعے سے تم میں اتفاق پیدا کیا۔ تم مفلس تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم کو دولت مند کیا۔"

آپؐ کے ہر ہر فقرے پر انصار کہتے تھے کہ "خدا اور رسولؐ کا احسان سب سے

---

[1] سیرت النبی جلد اوّل ص ۵۶۱

پڑھ کر رہے"۔

آپؐ نے فرمایا، نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) تجھ کو جب لوگوں نے جھٹلایا، تو ہم نے تیری تصدیق کی۔ تجھ کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی، ہم نے ہر طرح کی مدد کی"۔ یہ کہہ کر آپؐ نے فرمایا کہ تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے، لیکن اے انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو لے کر اپنے گھر آؤ!"۔ [1]

انصار بے اختیار چیخ اُٹھے کہ "ہم کو صرف محمّد صلی اللہ علیہ وسلم درکار ہیں"۔ اکثروں کا یہ حال ہُوا کہ روتے روتے داڑھیاں تر ہو گئیں۔ آپؐ نے انصار کو سمجھایا کہ مکہ کے لوگ جدید الاسلام ہیں، میں نے اُن کو جو کچھ دیا، حق کی بنا پر نہیں تالیفِ قلب کے لیے دیا"۔ [2]

اِس واقعہ سے نہ صرف آپؐ کی حکمت و دانائی، تدبیر و تدبّر کی گہرائی ہی کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کس قدر معاملہ فہم، زیرک و دانا تھے اور نازک سے نازک معاملے کو کیسی خوش اسلوبی سے سلجھا لینے کے اہل تھے، اور یہ ایسی خوبیاں ہیں جن کا ایک اعلیٰ انسان میں پایا جانا ضروری ہے۔

دنیاوی لحاظ سے انصار کا شکوہ و شکایت بجا تھی، جو عام حالات میں فوجی بغاوت کی شکل اختیار کر سکتی تھی، خصوصاً اُن حالات میں جب کہ فوج تنخواہ دار نہ ہو اور اُس کی فتح کا دنیاوی انعام مالِ غنیمت ہی ہو، لیکن حضورؐ نے انصار کو بلا کر جب اِس حقیقت کا اظہار کیا کہ "میرے ذریعے تم گمراہی سے نکلے، متحّد ہوئے اور دولت مند بنے"، تو انصار لاجواب ہو گئے، لیکن انصار کو لاجواب کر دینا ہی حضورؐ کا مقصود و منشا نہ تھا کہ لاجواب کر دینے سے غصّہ فرو نہیں ہوتا اور نہ ہی شکوہ و شکایت دُور ہوتی ہے، اس لیے حضورؐ نے اپنے متعلق اُس حقیقت کا بھی اظہار برملا کر دیا، جسے انصار بطور اُن کے

---

[1] سیرت النبی جلد اوّل ص ۵۴۳ [2] سیرت النبی جلد اوّل ص ۵۶۳

پیروکے زبان پر تو نہ لا سکتے تھے، لیکن بحیثیت انسان اُن کے دل میں اُن حقائق کا موجود ہونا ایک فطری بات تھی کہ "محمدؐ کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے اُن کی تصدیق کی، جب، مکہ والوں نے انہیں نکال باہر کیا، تو ہم نے انہیں پناہ دی اور اُن کی ضرورتوں کے کفیل ہوئے، جب وہ مفلس تھے"۔ یہ وہ حقیقت تھی جس کا انصار کے دلوں میں ہونا ایک فطری امر تھا، جس کا آپؐ نے خود اقرار کیا اور کہا کہ یہ سب سچ ہے، لیکن یہ تو بتاؤ! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں گھر لے جائیں اور تم محمدؐ کو اپنے گھر لے جاؤ۔

محمدؐ کو اپنے گھر لے جانے والی بات میں یہ عظیم حقیقت پنہاں تھی کہ قریش جس لائق تھے، انہیں وہی دیا گیا ہے اور انصار جس انعام و اکرام کے مستحق ہیں، انہیں اُسی سے نوازا گیا ہے۔ اِس پر انصار کا بے اختیار پکار اُٹھنا کہ ہمیں صرف محمدؐ درکار ہیں اور اُن میں سے اکثر کا رو رو کر بے حال ہو جانا، گویا اصل حقیقت کا پا جانا ہے، جسے اہلِ مکہ نہ ہجرت سے پہلے پا سکے تھے اور نہ اب حنین میں مالِ غنیمت کا بہت بڑا حصّہ حاصل کرتے وقت پا سکے۔

یہ تھی مدینۃ العلمؐ کے خطبے کی بلاغت و فصاحت، جس نے انصار کے سارے گلے شکوے دُور کر دیئے، اور اُن کے سینوں میں ٹھنڈک ڈال دی اور اللہ کے رسولؐ سے اُن کی مہر و محبت دوچند کر دی۔

اِس مرحلے پر تاریخ دانوں اور مغرب زدہ مسلمانوں سے یہ سوال کرنے کو جی چاہتا ہے کہ تاریخِ عالم سے وہ کسی ایسے عظیم مصلح، انقلابی یا فاتح کی نشان دہی تو کر دیں، جس نے اپنی مجبوریوں اور کمزوریوں کا اپنی قوم اور فوج سے یوں برملا اظہار کیا ہو، جیسے حضورؐ نے انصار سے کیا، اور ذرا اُس قوم اور اُس فوج کی بھی نشان دہی کر دیں، جس کی مہر و محبت اپنے مصلح اور سپہ سالار سے اُس وقت دوچند ہو گئی ہو، جب اُس نے اپنی مجبوریوں اور کمزوریوں کا برملا اظہار کیا ہو؟

نہیں، نہیں، تاریخ دانوں، مغرب زدہ مسلمانوں اور نام نہاد انقلابیوں کو تاریخِ عالم

میں نہ تو ایسا مُصلح ملے گا، نہ ایسا انقلابی اور نہ ہی کوئی ایسا سپہ سالار اور نہ کوئی دوسرا ایسا انسان ہی ملے گا، جس نے ہر نازک موقعہ پر انتہائی بردباری، تدبّر، خوش اُسلوبی، عالی حوصلگی اور خوش معاملگی سے اُمورِ متنازعہ کو طے کر لیا ہو، جیسا کہ آپؐ نے کیا، یہ صرف اِس بنا پر کہ آپؐ انسانِ کامل تھے، اور یہ آپؐ ہی کا حصّہ تھا۔

۸ھ میں حزن و ملال جن سے آپؐ دوچار ہوئے، وہ آپ کے بیٹے ابراہیم کی سترہ یا اٹھارہ ماہ کی عمر میں وفات تھی، جو جنابہ ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے اور اِسی برس آپؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے انتقال فرمایا۔

رجب ۹ھ میں شام کے وہ سوداگر جو مدینہ میں روغنِ زیتون فروخت کرنے آیا کرتے تھے، یہ خبر لائے کہ رومیوں نے غسانی (عیسائی عرب خاندان، جو رومیوں کے زیرِ اثر شام پر حکمران تھا) سے عرب خصوصاً مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے ایک بڑا لشکر تیار کروایا ہے، کیونکہ عرب میں قحط کی بنا پر اُسے فتح کرنا آسان ہے۔ آپؐ نے آگے بڑھ کر حملہ آوروں کو روکنے کے لیے تمام عرب قبائل کو اِس دفاعی مہم میں شریک ہونے کو کہا۔ چونکہ یہ اُس وقت کی ایک عظیم طاقت سے جنگ کا معاملہ تھا، اِس کے لیے ایک بہت بڑی جمعیّت اور اُس کے لیے کثیر سامانِ رسد کی ضرورت تھی اور مدینہ سے شام تک کا سفر کئی دن کا تھا، اِس لیے اکثر صحابہ کرامؓ نے مال و زر یہاں تک کہ اثاثُ البیت تک لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈھیر کر دیئے۔ حضرت عثمانؓ سب سے مالدار صحابی تھے، اُنہوں نے دو سو اوقیہ چاندی اور دو سو اونٹ پیش کئے۔ اُس زمانے میں سخت قحط تھا اور گرمی بھی شدت کی تھی، اِس لیے لشکر کے اکٹھا کرنے میں خاصی دشواری پیش آئی، دشواری کا ایک سبب وہ منافق تھے، جو مسلمانوں کو مسلسل بہکا رہے تھے کہ اِس گرمی میں باہر نہ نکلو، جس کی شہادت قرآن نے اِن الفاظ میں دی ہے "ان لوگوں نے کہا کہ گرمی میں نہ نکلو۔ کہہ دو کہ جہنم کی آگ اور زیادہ گرم ہے۔"

آپؐ تیس ہزار کی جمعیّت کے ساتھ، جس میں دس ہزار گھوڑے تھے، تبوک کی طرف بڑھے، لیکن شام کا حکمران غسانی عیسائی عرب خاندان مسلمانوں کے مقابلے کیلئے

تبوک کی طرف نہ بڑھا۔ آپؐ نے مع تیس ہزار کی جمعیت کے تبوک میں بیس دن قیام کیا اور اس دوران میں گرد و نواح کے چند عیسائی سرداروں نے حاضر ہو کر جزیہ دینا منظور کر لیا۔ یہ سب سے بڑا اسلامی لشکر تھا، جو کسی دشمن کے مقابلے میں نکلا تھا، لیکن اس کا کسی سے مقابلہ نہ ہُوا، اور اس واقعہ نے اسلامی تاریخ میں غزوۂ تبوک کا نام پایا۔

۹ھ کا دوسرا مشہور واقعہ مدینہ کے نواح میں مسجدِ ضرار کو نذرِ آتش کرنے کا ہے، جو منافقین نے اِس لیے تیار کی تھی کہ اُس میں اکٹھے ہو کر مسلمانوں میں پھوٹ ڈال سکیں، جس سے متعلق قرآن نے یہ شہادت دی:

> "اور وہ لوگ جنھوں نے ایک مسجد ضرار اور پھوٹ ڈالنے اور کفر کی غرض سے تیار کی، اور اس غرض سے کہ جو لوگ پہلے سے خدا اور اُس کے رسول سے لڑتے ہیں اُن کو ایک کمین گاہ ہاتھ آئے، اور وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم نے صرف بھلائی کے لحاظ سے ایسا کیا، اور خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹ کہتے ہیں۔ محمدؐ! تو کبھی اِس مسجد میں جا کر نہ کھڑا ہو۔" (سورۂ توبہ)

دنیائے اسلام میں مسجدِ ضرار کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسی مسجد ہو، جسے مسلمانوں نے اپنے ہی ہاتھوں سے نذرِ آتش کیا ہو، لیکن اِس واقعہ سے اُمّتِ مسلمہ کو شاید یہ سبق دینا بھی مقصود ہے کہ جو چیز بھی مسلمانوں اور اُمّتِ مسلمہ میں پھوٹ ڈالنے کا سبب بنے، چاہے وہ مسجد ہی کیوں نہ ہو، اُسے نذرِ آتش کر دیا جائے۔

آسمانی ہدایت و راہ نمائی کا دروازہ تو دینِ اسلام کے مکمل ہونے کے ساتھ ہی بند ہو گیا تھا، لیکن حضورؐ کا یہ قول و فعل اُمّتِ مسلمہ کے لیے تا قیامت مشعلِ راہ ہے کہ ہر وہ ادارہ جو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے بنایا گیا ہو، مسجدِ ضرار کا سا حکم رکھتا ہے اور اُس کا نذرِ آتش کیا جانا ہی بہتر ہے تاکہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی جڑ کاٹ دی جائے اور ایسے ادارے کو وجود میں لانے والے لوگ، گو نام کے وہ مسلمان

ہی کیوں نہ ہوں، اُنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہی کیوں نہ دیکھا ہو اور حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت ہی کیوں نہ کی ہو، منافق ہیں۔ چاہے وہ اِس بات کی قسم ہی کیوں نہ کھاتے ہوں کہ اُنھوں نے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ایسا کیا ہے۔ گویا اسلام میں کسی بھی دینی یا مذہبی ادارے کے معتبر ہونے کا سب سے بڑا، اولین ثبوت مسلمانوں کے اتحاد کو پختہ کرنے والا ہے نہ کہ اُن میں پھوٹ ڈالنے والا۔

آج کے مسلمانوں کے لیے مسجدِ ضرار کا واقعہ مشعلِ راہ ہونا چاہیے، اُن مساجد اسلامی مدرسوں اور اداروں کو جانچنے کے لیے جو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے مسلسل استعمال ہو رہے ہیں، اور ایسے اداروں کو چلانے والے چاہے وہ شیخ الحدیث ہی کیوں نہ کہلاتے ہوں یا دورِ حاضر کے سائنسی مفسرِ قرآن پکارے جاتے ہوں، قرآنی نقطۂ نگاہ سے صحیح العقیدہ مسلمان نہیں بلکہ فتنہ پرور اور کاذب ہیں۔

۹ھ کا تیسرا بڑا واقعہ ایلاء کا ہے۔ یہ واقعہ تبوک کی دفاعی مہم سے قبل کا ہے، جب آپؐ نے ایک مہینے کے لیے ازواجِ مطہرات سے علیحدگی کے دن گزارے۔ ازواجِ مطہرات خصوصاً حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے ایکا کیا۔ تاکہ حضورؐ سے توسیعِ نان و نفقہ کی بات منوا سکیں، دوسرے حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ یہ بھی چاہتی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُمُّ المومنین حضرت زینبؓ کے یہاں زیادہ بیٹھنے سے گریز کریں، جس کا سبب صرف اتنا تھا کہ حضرت زینبؓ کو کہیں سے کچھ شہد میسّر آگیا تھا، جو انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شہد چونکہ مرغوب تھا، اِس لیے شہد کھانے کے لیے آپ چند دن سے حضرت زینبؓ کے یہاں کچھ زیادہ وقت گزارنے لگے تھے، جو حضرت عائشہؓ کو پسند نہ تھا۔ انھوں نے حضرت حفصہؓ کے مشورے سے یہ طے کیا کہ حضورؐ دونوں میں سے جس کے گھر بھی آئیں، اُن سے کہا جائے کہ آپؐ کے منہ سے مغافیر کی بُو آتی ہے (کہ مغافیر کے پھولوں سے بھی شہد کی مکھیاں رس چوستی ہیں)۔

آپ کو حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے متفقہ بیان کا یقین سا ہو گیا۔ آپؐ

نہایت لطیف المزاج تھے اور کسی قسم کی بُو بھی آپؐ کو نہایت ناگوار گزرتی تھی، اِس لیے آپؐ نے یہ قسم کھائی کہ میں شہد نہیں کھاؤں گا، جس سے حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کا جو مقصود تھا، حاصل ہو گیا کہ شہد کھانے کو حضرت زینبؓ کے یہاں زیادہ دیر آپؐ کا بیٹھنا کم ہو گیا، لیکن اللہ نے اپنے نبیؐ کی راہبری یہ کہہ کر فرمادی کہ:

"اے نبیؐ! اپنی بیویوں کی خوشی کے لیے تم اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام کیوں کرتے ہو"۔ (سورۃ التحریم)

دوسرا مقصد ایک کا جس میں قریباً سبھی ازواجِ مطہرات شریک تھیں، نان و نفقہ کی توسیع سے متعلق تھا۔ اکثر ازواجِ مطہرات عرب کے رئیس گھرانوں سے متعلق تھیں، جو ناز و نعم میں پلی بڑھی تھیں، اور حضورؐ کی حالت یہ تھی کہ جو بھی مال و زر ہاتھ لگتا تھا، اُسے فوراً ہی صحابہ میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ آپؐ کے اپنے گھروں کی حالت یہ تھی کہ ان میں چولہے بھی گرم نہ ہوتے تھے۔ کہیں دودھ پر گزارا ہو رہا ہے، کہیں کھجوروں پر اور کہیں ستّو پانی میں گھول کر پیتے جا رہے ہیں اور یہی حال گھروں کے ساز و سامان اور لباس وغیرہ کا بھی ہو گا، جس سے ازواجِ مطہرات نالاں تھیں۔ جب اسلام کا دائرہ وسیع ہوا، فتوحات وغیرہ سے مالِ غنیمت حاصل ہونے لگا تو ازواجِ مطہرات کا تقاضا اور بڑھا، لیکن حضورؐ کا رویّہ وہی رہا کہ جو کچھ آیا، اُسے صحابہ میں بانٹ دیا اور خود دامن جھاڑ کر گھر چلے گئے، جو ازواجِ مطہرات کو اچھا نہ لگتا تھا۔

ازواجِ مطہرات کی طرف سے توسیعِ نان و نفقہ کے مطالبے نے جب زور پکڑا تو ازواجِ مطہرات سے کنارہ کش ہو کر ایک بالاخانے پر منتقل ہو گئے۔ آہستہ آہستہ حضورؐ کی علیحدگی کی خبر صحابہ کے کانوں تک پہنچی اور صحابہ یہ خیال کرنے لگے کہ حضورؐ نے ازواج کو طلاق دے دی ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ اِس خبر کی تصدیق کے لیے اُس بالاخانے پر گئے، جہاں عارضی طور پر آپؐ مقیم تھے اور بقول حضرت عمرؓ اُس بالاخانے کی حالت یہ تھی کہ "اندر گیا تو دیکھا آپؐ کھری چارپائی پر لیٹے ہیں اور جسم مبارک پر بانوں کے نشان پڑ

گئے ہیں ۔ اِدھر اُدھر نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک طرف مٹھی بھر جَو رکھے تھے ۔ ایک کونے میں کسی جانور کی کھال کھونٹی پہ لٹک رہی تھی“ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ۔ آنحضرتؐ نے سبب پوچھا ۔ میں نے عرض کی ، اِس سے بڑھ کر رونے کا اور کیا موقع ہوگا ۔ قیصر و کسریٰ باغ و بہار کے مزے لوٹ رہے ہیں ، اور پیغمبر ہو کر آپؐ کی یہ حالت ہے ؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ” تم اِس پر راضی نہیں کہ قیصر و کسریٰ دنیا لیں اور ہم آخرت “

میں نے عرض کی کہ کیا آپؐ نے ازواج کو طلاق دے دی ہے ؟ آپؐ نے فرمایا ۔ ” نہیں “ ۔ میں اللہ اکبر پکار اٹھا ۔ پھر عرض کی کہ مسجد میں تمام صحابہ مغموم بیٹھے ہیں ، اجازت ہو تو جا کر خبر کر دوں کہ واقعہ غلط ہے [1]

قرآن نے آپؐ کی گھریلو زندگی کے اِس واقعہ پر یوں تبصرہ کیا ہے :

” اے نبی ! اپنی بیویوں سے کہہ دے کہ اگر تم کو دنیاوی زندگی اور دنیا کا زیب و آرائش مطلوب ہے ، تو آؤ ، میں تم کو رخصتی جوڑے دے کر بہ طریقِ احسن رخصت کر دوں اور اگر اللہ ، اللہ کا رسول اور آخرت مطلوب ہے تو اللہ نے تم میں سے نیکو کاروں کے لیے بڑا ثواب مہیا کر رکھا ہے “ ۔ (سورۂ احزاب)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کے اِس واقعہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے اہل و عیال مسلسل فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے ، اور جب فقر فاقے کی اِس زندگی سے تنگ آ کر نان و نفقہ کی توسیع کے لیے ازواجِ مطہرات نے حضورؐ پر دباؤ ڈالا ، تو بھی فقر و فاقہ کی زندگی پر آپؐ ثابت قدم رہے اور اُن سے علیحدگی اختیار کر لی ۔ حضورؐ کی اِس روش کو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف درست قرار دیا بلکہ یہ حقیقت بھی بیان کر دی کہ وہ جنہیں اللہ ، اُس کا رسولؐ اور آخرت مطلوب ہے ، اُن کی نگاہ زیب و زینت

---

[1] سیرت النبی جلد اوّل صـ ۵۷۲

دنیا پر نہیں ہونا چاہیئے۔ گویا ایک طرف تو دنیاوی زندگی کے آرام و آسائش اور اُس کی سجاوٹ و بناوٹ ہے، جو اِس مختصر سی زندگی کے لیے ہے اور دوسری طرف اللہ اور اُس کے رسولؐ کی محبت ہے، جس کا نتیجہ آخرت کی ختم نہ ہونے والی زندگی کی بے پایاں مسرتیں ہیں۔

بظاہر تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کا ایک واقعہ ہے، لیکن قرآن کا اِس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد محض واقعہ کو بیان کر دینا ہی نہیں کہ حضورؐ کی گھریلو زندگی کے بہت سے اور بھی واقعات ہیں، جن کا ذکر احادیث کی کتب میں ملتا ہے، لیکن قرآن نے اُن کا تذکرہ نہیں کیا۔ اِس واقعہ کا خاص طور پر ذکر اِس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اِس میں کچھ ایسی حقیقت ہے، جس سے اُمّتِ مسلمہ راہ نمائی حاصل کر سکتی ہے۔ جو حقیقت بیان ہوئی ہے وہ یہی نظر آتی ہے کہ دنیا کے طالبوں کو مال و دولت دے کر اور آرام و آسائش مہیا کر کے اُن کی طلب ایک طرح پوری کر دی جاتی ہے، لیکن اللہ اور اُس کے رسولؐ کے طالبوں کو مال و دولت سے محروم رکھ کر وہ کچھ دیا جانے والا ہے، جسے اجرِ عظیم کا نام دیا گیا ہے۔ صحابہ کرام اور اولیائے عظام کی زندگیوں پر ایک نظر ڈالنے سے جو حقیقت نمایاں نظر آتی ہے، وہ یہی ہے کہ اللہ اور اس کے رسولِ مقبولؐ کے عشّاق کے اِس گروہ کے اکثر و بیشتر افراد مال و دولت، زینت و زیبائش دنیا سے کنارہ کش رہے اور پوری توجہ مقصودِ حقیقی پر مرتکز رکھی اور سینکڑوں برس گزر جانے پر بھی یہ حقیقت ماہِ چاردہم کی طرح ہم سب پر عیاں ہے کہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے والے یہ لوگ دنیائے اسلام کی کس قدر محترم ہستیاں ہیں۔ حضرت سری سقطیؒ، جناب جنید بغدادیؒ اور جناب شبلیؒ سے حضرت علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش، جناب معین الدین چشتی اجمیریؒ، جناب بختیار کعکیؒ، بابا فرید گنج شکرؒ اور جناب نظام الدین اولیاءؒ تک کسی پر بھی نظر ڈالیے، سبھی ایک ہی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں، جو رنگ ہے اللہ کے رسولؐ کا رنگ اور جو رنگ ہے فقر و فاقہ اور حُبِ الٰہی کا رنگ۔

اُمّت کی ماؤں پر اللہ نے یہ بات واضح کر دی کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ سے

محبّت کرنے والوں کو دنیا طلبی زیب نہیں دیتی ۔ چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضؓ سے احکامِ الٰہی کے بارے میں استفسار فرمایا، تو انہوں نے کہا کہ "میں سب کچھ چھوڑ کر خدا اور رسول کو لیتی ہوں"، دیگر تمام ازواجِ مطہرات رضؓ نے بھی اسی قسم کے جواب عرض کئے، بہر طور ایک ماہ کی ازواجِ مطہرات سے یہ علیحدگی ختم ہو گئی ۔

۹ھ کا آخری قابلِ ذکر واقعہ حجِ اسلام اور اعلانِ برأت ہے ۔ مکہ رمضان ۸ھ میں فتح ہو چکا تھا اور مسلمانوں نے حج بھی کیا تھا، لیکن اُس میں مشرکین بھی شریک ہوئے تھے، جو قبل از اسلام بھی اپنے طریقے اور اپنی خاص رسوم کے مطابق حج کرتے چلے آئے تھے ۔ ۹ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضؓ کو تین سو مسلمانوں کا قافلہ سالار بنا کر حج کے لیے روانہ فرمایا اور حضرت علی رضؓ نقیبِ اسلام تھے ۔ حضرت ابوبکر رضؓ نے مناسکِ حج کی لوگوں کو تعلیم دی اور حضرت علی رضؓ نے سورۂ برأت کی چالیس آیتیں پڑھ کر سنائیں اور اعلان کر دیا کہ اب کوئی مشرک خانہ کعبہ میں داخل نہ ہو سکے گا اور نہ کوئی شخص برہنہ ہو کر حج کر پائے گا ۔

اِسی برس نجاشی، شاہِ حبش (ایتھوپیا) جس نے مکہ کے مسلمان مہاجرین کو اپنے ملک میں پناہ دی اور بعد کو خود بھی مسلمان ہو گیا تھا) نے وفات پائی اور حضورؐ نے مدینہ میں اُس کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھائی ۔

۱۰ھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا آخری برس ہے اور اس کا سب سے اہم واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حج بیت اللہ، جسے حجۃ الوداع اِس لیے کہا جاتا ہے کہ حضورؐ نے اِس حج میں مسلمانوں کو الوداع کہی ۔ رمضان ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد سورۂ فتح کے نزول پر آپؐ کو اشارۃً یہ بتا دیا گیا تھا کہ اِس دنیا کے بسنے والوں کی راہنمائی کا کام آپ تکمیل کو پہنچا چکے ہیں، اور اب رفاقتِ الٰہی کے لیے تیاری فرمائیں ۔ آپؐ نے اعلان فرمایا کہ امسال آپؐ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں ۔ یہ خبر دُور و نزدیک پھیل گئی اور آپؐ کی معیت کی سعادت حاصل کرنے کو مسلمان جوق در جوق مدینہ

پہنچنے لگے۔

۲۶۔ ذیقعدہ سنہ ۱۰ھ کو ظہر کی نماز کے بعد آپؐ مدینہ سے نکلے، ازواجِ مطہرات بھی آپؐ کے ساتھ تھیں۔ مدینہ سے قریباً چھ میل پر ذوالحلیفہ (جو اب بیر علی کہلاتا اور مدینہ کی میقات ہے) میں رات گزاری۔ دوسرے دن آپؐ نے غسل فرما کر احرام باندھا اور پھر قصواء نامی اونٹنی پر سوار ہو کر بلند آواز میں کہا:

اے اللہ! ہم تیرے سامنے حاضر ہیں!

اے اللہ! تیرا کوئی شریک نہیں۔ ہم حاضر ہیں، تعریف اور نعمت سب تیری ہی ہے، اور سلطنت میں تیرا کوئی شریک نہیں۔

اِس حج بیت اللہ میں، ہجرت کے بعد جو آپؐ کا پہلا اور آخری حج تھا، آپؐ کے ساتھ کم و بیش ایک لاکھ مسلمان شریک تھے۔ آپؐ نے مدینہ سے مکہ تک راستہ نو دن میں طے کیا اور ۴۔ ذوالحجہ کو مکہ میں داخل ہوئے۔ کعبہ پر نظر پڑی تو کہا "اے اللہ! اِس گھر کو اور زیادہ عزت و شرف دے!"

طوافِ کعبہ سے فارغ ہو کر آپؐ نے مقامِ ابراہیم پر دوگانہ ادا کیا، پھر صفا اور مروہ کی سعی کی۔ جو لوگ قربانی کے جانور ساتھ نہیں لاتے تھے، اُنہیں اِس عمرہ کے اختتام پر احرام اُتارنے کو کہا۔ قربانی کے اونٹ چونکہ آپؐ کے ساتھ تھے، اس لیے آپؐ نے احرام نہیں اُتارا۔ آٹھویں کا دن آپؐ نے تمام مسلمانوں کے ساتھ منیٰ میں قیام فرمایا اور نویں کو فجر کی نماز کے بعد منیٰ سے عرفات روانہ ہوئے۔ دوپہر کے ڈھلنے تک آپؐ نے نمرہ کے مقام پر اپنے خیمے میں آرام کیا اور پھر اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر مسلمانوں سے خطاب فرمایا:

(۱) ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں۔

(۲) لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔

(۳) ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سُرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سُرخ پر کوئی فضیلت

نہیں، مگر تقویٰ کے سبب سے۔

(۴) ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی اور مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔

(۵) تمہارے غلام تمہارے غلام! جو خود کھاؤ، وہی اُن کو کھلاؤ! جو خود پہنو وہی اُن کو پہناؤ۔

(۶) جاہلیت کے تمام خون (یعنی انتقامِ خون) باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں (اپنے خاندان کا خون) ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون باطل کر دیتا ہوں۔

(۷) جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیئے گئے، اور سب سے پہلے اپنے خاندان کا سود عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں۔

(۸) عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو! تمہارا حق عورتوں پر، اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔

(۹) تمہارا خون اور تمہارا مال تاقیامت اسی طرح حرام ہے، جس طرح یہ دن اِس مہینہ میں اور اِس شہر میں حرام ہے۔

(۱۰) میں تم میں ایک چیز چھوڑے جاتا ہوں، اگر تم نے اِس کو مضبوط پکڑ لیا، تو گمراہ نہ ہوگے۔ وہ کیا چیز ہے، کتاب اللہ۔

ان بنیادی احکام کے بعد آپؐ نے چند اصولی احکام کا اعلان فرمایا:

(۱۱) اللہ نے ہر حق دار کو (از روئے وراثت) اس کا حق دے دیا، اب کسی کو وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں۔

(۱۲) لڑکا اُس کا ہے، جس کے بستر پر پیدا ہوا۔ زناکار کے لیے پتھر ہے اور اُس کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔ جو لڑکا اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کے نسب سے ہونے کا دعویٰ کرے، اور جو غلام اپنے مولیٰ کے سوا کسی اور طرف اپنی نسبت کرے، اُس پر اللہ کی لعنت ہے۔

(۱۳) ہاں، عورت کو اپنے شوہر کے مال میں سے اُس کی اجازت کے بغیر کچھ دینا جائز

نہیں۔ قرض ادا کیا جائے، عاریت واپس کی جائے، ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔

لوگو! اللہ کے یہاں تم سے میری نسبت پوچھا جائے گا، تو تم کیا جواب دو گے؟

صحابہ نے جواباً عرض کی "ہم کہیں گے کہ آپؐ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا" آپؐ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا، "اے اللہ! گواہ رہنا" [1]

حضورؐ کے اُن خطبوں کے اقتباسات جو انہوں نے قربانی کے دنوں میں منیٰ میں دیئے، عرفات کے دن کے خطبے ہی کا حصہ شمار ہوتے ہیں، کیونکہ روایتوں میں یہ تصریح نہیں کہ آپؐ نے کون کون سی باتیں، کس کس دن کے خطبے میں کہیں، لہٰذا وہ یہ ہیں:

(۱۴) مذہب میں غلو اور مبالغہ سے بچو! کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی سے برباد ہوئیں۔

(۱۵) حج کے مسائل سیکھ لو، میں نہیں جانتا شاید کہ اس کے بعد مجھے دوسرے حج کی نوبت نہ آئے۔

(۱۶) ابتدا میں اللہ نے جب آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا، زمانہ پھر پھرا کے آج پھر اُسی نقطہ پر آ گیا ہے۔

(۱۷) سال کے بارہ مہینے ہیں، جن میں چار مہینے قابلِ احترام ہیں۔ تین متواتر مہینے ہیں، ذوقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور چوتھا رجب مضر کا مہینہ ہے، جو جمادی الثانی اور شعبان کے بیچ میں ہے۔

(۱۸) تو تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری آبرو (تا قیامت) اسی طرح محترم ہے،

---

[1] سیرت النبی جلد دوم صفحہ ۱۹۰ تا ۱۹۶

جس طرح یہ دن، اِس مہینہ میں اور اِس شہر میں محترم ہے۔

(۱۹) ہاں میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ خود ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ تم کو رب کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا، اور تم سے تمہارے اعمال کی بازپرس کرے گا۔

(۲۰) ہاں! مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے۔ ہاں! باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں اور بیٹے کے جرم کا جواب دہ باپ نہیں۔

(۲۱) اگر کوئی نک کٹا (نکٹا) غلام بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تم کو اللہ کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اُس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔

(۲۲) ہاں شیطان اِس بات سے مایوس ہو چکا کہ اب تمہارے اِس شہر میں اُس کی پرستش قیامت تک نہ کی جائے گی، لیکن البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اُس کی پیروی کروگے اور وہ اِس پر خوش ہوگا۔

(۲۳) اپنے پروردگار کو پوجو! پانچوں وقت کی نماز پڑھو، مہینے کا روزہ رکھا کرو اور میرے احکام کی اطاعت کرو، خدا کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

منیٰ میں بھی آپؐ نے خطبات سے فارغ ہو کر سننے والوں سے پوچھا:

"کیوں، میں نے پیغام خداوندی سنا دیا؟"

صحابہ نے عرض کیا "ہاں!"

آپؐ نے کہا "اے اللہ! تو گواہ رہنا"

ایک بار پھر آپؐ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا "جو لوگ اِس وقت موجود ہیں، وہ اُن کو سنا دیں، موجود نہیں ہیں[1]"

آقائے نامدارؐ کے عرفات اور منیٰ کے خطبات کے یہ اقتباسات مختلف کتب احادیث سے لیے گئے ہیں، انہیں اسلامی تعلیمات کا خلاصہ اور عطر کہا گیا ہے۔ ان فرمودات نبویؐ کے مقاصد و معانی گو عیاں ہیں، لیکن اِن پر غور و فکر کی ایک نظر ڈالنا

---

[1] سیرت النبی جلد دوم صفحہ ۱۹۹ تا ۲۰۴

اِس لیے ضروری ہے کہ حضورؐ کا اُمّت کے اجتماعِ عظیم سے یہ آخری خطاب ہے اور اِس میں وافر مقدار میں ایسے ایسے گل ہائے عطر بیز، گوہر ہائے گراں مایہ اور دُر ہائے نایاب عیاں و پنہاں نظر آتے ہیں، جو بنی نوع انسان کے کسی بھی ہادیِ برحق، معلمِ اخلاق، کسی بھی فلسفی، شاعر و ادیب اور کسی بھی قائد و راہبر کے کلام میں اتنی کثیر مقدار میں نہیں، گو کہ پھول تو بہت سے شعراء و ادباء کی باتوں سے بھی جھڑے ہیں، موتی تو بہت سے معلمینِ اخلاق و فلاسفۂ یونان و توران، عرب و عجم، مغرب و مشرق کے اقلام سے بھی ٹپکے ہیں اور سچے اور سُچے پیغامات تو بہت سے پیغمبرانِ خدا نے بھی بنی نوعِ انسان کو دیئے ہیں، لیکن گوہر افشانی جو نبی اُمّیؐ نے فرمائی اور جس کثرت سے فرمائی، وہ کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی اور نہ ہوگی۔

تو آیئے یہ دیکھیں کہ آبِ حیات چھڑکے اِن سدا بہار پھولوں کی کیسی روح پرور خوشبو ہے، جو انہیں تاحال بنی نوع انسان کی قوتِ شامّہ کے لیے لطیف و نظیف بنائے ہوئے ہے۔ تو آیئے یہ پرکھیں کہ اِن گوہر ہائے گراں مایہ کی کیسی لازوال چمک ہے، جو صدیاں گزر جانے پر بھی ماند نہیں پڑی، اور آیئے اِس بات کا کھوج لگائیں کہ خِطّۂ ارضی کی کوکھ گزشتہ چودہ صدیوں سے ایسے دُر ہائے نایاب کیوں پیدا نہیں کر سکی؟

(۱) سب سے پہلی بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کے دَسَاتیر کو پاؤں کے نیچے ملنے کی فرمائی۔ عرب کے دورِ جاہلیت کے دَسَاتیر میں رنگ و نسل کی برتری، امیر و غریب کا امتیاز، مذہب کے معاملات میں ایک خاص طبقے کی اجارہ داری تھی۔ کالا، گورے کا ہمسر نہ تھا، غریب کی آواز امیر کے سامنے کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔ کاہنوں، پروہتوں اور مُتولّیوں کے سامنے عوام ڈھور ڈنگر تھے کہ وہ اُن بے ہودہ مراسم کو مختلف بتوں کے سامنے ادا کرنے کے طور طریقوں سے واقف نہ تھے، جو اِس طبقے نے وارثتاً سیکھی تھی۔ زر خرید غلام اپنے آقا کے سامنے دم مارنے تک کا مجاز نہ تھا۔ لڑکیاں اِس لیے زندہ دفن کر دی جاتی تھیں کہ داماد کی سی برتر مخلوق کو سر پہ لا کھڑا کرنے کا سبب بنتی تھیں، جس کے سامنے سر جھکانا

پڑتا تھا، یہ سب جاہلیت کے دستور تھے، جو ننگِ آدمیت تھے، لہٰذا آدمیت کی سربلندی کے لیے ان کا پاؤں تلے مسلا جانا ہی ضروری تھا، سو اُس نے مل دیا، جو عظمتِ آدم کا پیغام لے کر دنیا میں آیا تھا کہ وہ خود فخرِ آدم تھا، اور ہے۔

(۲) جس طرح ہر انسان کسی ایک ہی شخص کے نطفے سے پیدا ہوا ہے اور بیک وقت وہ دو اشخاص کا بیٹا ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ فطرت کے خلاف ہے، عین اِسی طرح تمام مخلوق کا رب بھی ایک ہی ہو سکتا ہے کہ اصل ہر چیز کی ایک ہی ہے کہ دوئی جہاں بھی ہوتی ہے، فتنہ و فساد کا سبب بنتی ہے۔

(۳) لاکھ کے مجمع میں جو اُس وقت کے مسلمانوں کی اکثریت پر مشتمل تھا، اور اُس میں سوائے چند ایک کے سبھی عرب تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس بات کا برملا اعلان کر دیا کہ عرب کسی سے برتر نہیں ہیں کہ وہ کل کو اِس بات پر فخر نہ کر سکیں کہ اُمت کا رسول عربی ہے اور اُس کا قرآن عربی زبان میں ہے، لہٰذا عرب سب سے اعلیٰ و برتر ہیں، نہیں عربوں کو اِس بنا پر کوئی فوقیت و فضیلت حاصل نہیں اور نہ ہی کسی غیر عرب کو عربوں پر برتری حاصل ہے کہ وہ ایرانیوں و رومیوں کی طرح تہذیب و تمدن میں اعلیٰ و ارفع ہے اور رنگ روپ میں عربوں سے زیادہ سرخ و سفید ہے۔ فضیلت و برتری کا سبب اگر کوئی شے ہے تو وہ علم و تقویٰ ہے عالم و متقی تو وہ ہے، جو گناہوں سے بچنے والا، علومِ دین و دنیا کا جاننے والا ہو اور اُن پر عمل پیرا بھی ہو۔ گویا علم اور عمل ہی ہے جو انسان کی برتری کا ذریعہ ہے۔

جہالت، شرک و کفر کی اندھیاری دنیا میں طلسمِ رنگ و بو کو توڑ کر علم و عمل کا عَلم سب سے پہلے حضورؐ نے بلند کیا، لہٰذا اُن سے بڑا انقلابی اور کون کہلا سکتا ہے۔ جو انقلاب اِس انسانِ کامل نے بپا کیا۔ صدیوں بعد مغرب نے اُسے جمہوریت کی صورت میں اور مشرق کے روس و چین نے اُسے اشتراکیت و اشمالیت کی شکل میں اپنایا، لیکن دونوں نے اپنے اپنے دینی و لادینی عقائد و نظریات

کے پیشِ نظر اُس میں کچھ ترامیم واضافے کرلیے۔

(۴) مسلمان چاہے عرب کے ہوں یا عجم کے، مشرق کے ہوں یا مغرب کے آریا نسل کے ہوں یا سامی نسل کے، مشرق بعید کی زرد نسل سے ہوں یا افریقہ کی سیاہ نسل سے، سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اُن کی اُخوت، رشتہ وپیوند اور مہر ومحبت کی بنا صرف اسلام ہے۔ ملکوں کی حدیں، رنگوں کا امتیاز، زبانوں کا اختلاف، کوئی بھی چیز اُن کے بھائی چارے میں رکاوٹ نہیں بننی چاہیئے۔
نسل کی برتری، قبائل کی عصبیت اور اوطان کی حدود وقیود کو توڑ کر انسانوں کو جس عظیم قائد نے سب سے پہلے بین الاقوامیت کی راہ پر ڈال کر انسانی برادری کی راہ دکھائی وہ عظیم قائد، سرورِ عالمؐ ہیں۔ اُن سے بڑا انسان دوست اور کون ہو سکتا ہے۔ اُن ہی کی بتائی ہوئی راہ ہے جس پر مغرب نے لیگ آف نیشنز (جمعیتِ اقوام) اور پھر یونائیٹڈ نیشنز (اقوامِ متحدہ) کی بنیاد رکھی اور دورِ حاضر میں اُسی شاہراہِ نور سے ہٹ کر عرب ممالک نے عرب لیگ قائم کی ہے، اور مغرب ومشرق میں سرمایہ دار اور اشتراکی ممالک کی مختلف تنظیمیں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے نقشِ پا کی تقلید میں ہیں مگر ایک کج تقلید۔

(۵) غلامی انسانیت پر بڑا ہی بدنما داغ ہے، جس سے انسان ہمیشہ سے نفرت کرتا آیا ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت غلام جس حالت میں تھے، اُس کے بیان ہی سے دورِ حاضر کا جمہوریت پسند آزاد انسان کانپ اُٹھتا ہے، لیکن اُس زمانے میں غلاموں پر ظلم وزیادتی کوئی برائی خیال نہ کی جاتی تھی کہ اُس وقت کے معاشرے نے دولت مند کو یہ حق دے رکھا تھا کہ وہ اپنی دولت سے جس قدر چاہے بازار میں بکتے غیر ملکی یا جنگ میں شکست خوردہ اپنے ہی ملک کے دوسرے قبائل کے مرد وزن خرید کر اپنا لونڈی غلام بنالے اور اُن سے جیسا چاہے سلوک روا رکھے۔ اسلام پہلا انقلابی دین ہے، جس نے غلامی کے خلاف آواز اُٹھائی۔ غلامی کو گو حکماً ختم تو نہ کیا کہ ایسا اُس وقت ممکن نہ تھا، لیکن غلاموں کو ظلم واستبداد

سے نجات دلانے کے لیے ایک ایسی متبادل راہ نکالی، جس سے غلامی، غلامی نہ رہے بلکہ ملازمت کی سی شکل اختیار کر لے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اپنے غلاموں سے حسن سلوک کا حکم دیا، ویسا سلوک تو دورِ حاضر کا آجر، اجیر سے آج بھی نہیں کر رہا۔ اب جب کہ دنیا غلامی کی لعنت سے کئی برس پہلے نجات حاصل کر چکی ہے، اگر حضورؐ کا غلاموں سے سلوک سے متعلق فرمان آجر اور اجیر کے معاملے میں نافذ کر دیا جائے تو مالک اور مزدور کی رسہ کشی اور شورش جس سے اشتراکیت و اشتمالیت کا فتنہ برپا ہوا ہے، ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے، گو کہ اشتراکیت و اشتمالیت کے بڑے بڑے علم بردار ممالک بھی اپنے یہاں کے مزدوروں کو نہ تو وہ کھلاتے ہیں، جو خود کھاتے ہیں اور نہ ہی وہ پہناتے ہیں، جو خود پہنتے ہیں۔

روس کے حکمران اور مزدور طبقوں میں بودوباش، خورونوش کا جو نمایاں فرق ہے، وہ آج کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ اشتراکی ممالک ہی ہیں جو انسانی مساوات کے آج سب سے بڑے دعوی دار بنتے ہیں اور ان ہی کے پروردہ چیلوں نے اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں روس و چین کی نام نہاد انسانی مساوات کا ڈھنڈورا پیٹ کر وہاں کے عوام میں ایک فتنہ و فساد پھیلا رکھا ہے۔

(۶) انتقامِ خون کے جذبے نے بہت سے ممالک میں مسلسل قتل و غارت کا بازار گرم کئے رکھا ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت انتقامِ خون عرب میں ایک اَن لکھے قانون کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا۔ مقتول کا خاندان اپنا یہ اولین فرض خیال کرتا تھا کہ وہ قاتل کو قتل کرے، اگر وہ مر چکا ہے تو اُس کے خاندان کے کسی فرد کو بدلے میں قتل کر دیا جائے، اس طرح قتل در قتل نے سارے عرب میں ایک وحشت اور لاقانونیت پھیلا رکھی تھی۔ قتل جھے کہ انتقامِ خون میں ہوتے ہی چلے جاتے تھے اور اُن کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ معاشرے کی اصلاح

امن کے لیے ضروری تھا کہ ایسے وحشیانہ انتقامِ خون کے سلسلے کو ختم کر دیا جائے۔ سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچازاد بھائی ربیعہ کے بیٹے ایاس کا خون معاف فرما دیا، جسے قبیلہ بنو سعد میں پرورش کے دوران میں ہذیل نے قتل کر ڈالا تھا۔ قتلِ عمد اور قتلِ خطا کی سزائیں تو اسلام پہلے ہی مقرر کر چکا تھا، سو انتقامِ خون کا سلسلہ جو عوام نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا، ہمیشہ کیلئے ختم ہو گیا، جس سے عرب معاشرے میں امن و سکون کی بحالی میں بہت مدد ملی۔ عیسائی اور یہودی مؤرخین جس نبیؐ پر جنگجویانہ ذہنیت کا الزام لگاتے ہیں، درحقیقت وہ تو امن و آشتی کا پیغمبر ہے، جس نے دنیا کے ایک وحشی معاشرے کو امن بخشا اور یہ امن اسلام کے ساتھ ساتھ دنیا میں پھیلتا چلا گیا۔

(۷) سود کو زمانۂ قدیم سے ہر معاشرے میں بُرا خیال کیا جاتا رہا ہے کہ یہ ضرورت مند کا استیصال ہے، سرمایہ دار کی طرف سے، دوسرے یہ ایک بڑی شرح سے ناجائز منافع ہے بغیر کسی خسارے کا خطرہ مول لیے ہوئے۔ یہودی بڑے پیمانے پر یہ کاروبار مدینہ میں کیا کرتے تھے اور ادھر عرب کے دوسرے بڑے شہر مکہ میں یہ کاروبار سرمایہ داروں نے شروع کر رکھا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ضرورت مند و نادار بہت بُری طرح امراء کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے، لیکن سود کے اِس شکنجے سے اُن کو آزاد کروانے والا کوئی نہ تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملے میں بھی اپنے ہی چچا عباسؓ بن عبدالمطلب کے مفادات کو پسِ پشت ڈالا اور اُن کا تمام سود ختم کر دیا۔ اسلام چونکہ سود خوری کو حرام قرار دے چکا تھا، اِس لیے یہ ناپسندیدہ کاروبار اسلامی معاشرے سے ختم ہو گیا اور وہ لوگ جو ظہورِ اسلام سے قبل کے سود کے بندھنوں میں بندھے چلے آتے تھے، آزاد ہو گئے۔ آج قریباً چودہ صدیاں گزر جانے پر بھی سود کے چنگل میں جس طرح یورپ و امریکہ کے یہود و نصاریٰ نے اسلامی اور غریب ممالک کو جکڑ رکھا ہے اور یہ سرمایہ دار ممالک جس قدر مذکورہ ممالک

کی نفرت کا شکار ہیں، وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ سود کے ذریعے ضرورت مندوں کا ہی استیصال ہے، جو اشتراکیت کو جنم دینے کا ایک بڑا سبب ہے، گویا لادینی معاشروں و ممالک کا وجود ایک طرح یہود و نصاریٰ ہی کا پیدا کردہ ہے۔

اسلام پہلا انقلابی دین ہے، جس نے دنیا کی ایک اور بڑی لعنت کے خلاف عَلَمِ جہاد بلند کیا، اور اُسے باطل قرار دے کر مٹا دیا۔ دورِ حاضر میں اُسی دین کے پیروکار ممالک کا یورپی و امریکی یہودی و عیسائی سود ہی سے استیصال کر رہے ہیں، گویا یہود و نصاریٰ کا یہ انتقام ہے اُمّتِ محمّدیہ سے کیونکہ اُن کے انقلابی پیغمبر نے ضرورت مندوں اور غریبوں کا استیصال کرنے والے سرمایہ داروں کا ہاتھ شَل کر دیا تھا۔ حیرت ہے کہ آج اشتراکی ممالک اور اُن کے نام نہاد سرخ چیلے چانٹے اسلام پر ہی یہ الزام دھرتے ہیں کہ یہ دین سرمایہ داروں کا پشتیبان ہے۔

(۸) حضورؐ کا یہ فرمان کہ "تمہارا حق عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے"، مرد اور عورت کے ایک دوسرے پر حقوق کی نشان دہی کرتا ہے یعنی عائلی زندگی کی کامیابی ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی ہی سے ممکن ہے۔ فریقین میں سے جب کوئی ایک دوسرے کی حق تلفی کرے گا، تو عائلی زندگی خوشگوار نہیں رہے گی۔ چونکہ عرب معاشرے میں مرد کو بالادستی حاصل تھی، اِس لیے حضورؐ نے ساتھ ہی یہ ارشاد فرمایا کہ "عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو"، یعنی معاشرے کی عطا کردہ بالادستی ہی کو مدِنظر نہ رکھنا بلکہ اِس معاملے میں اللہ سے بھی ڈرنا۔ ظاہر ہے کہ جو اللہ سے ڈرتا ہے، وہ کسی کی حق تلفی نہیں کرتا، بلکہ وہ تو اپنے حقوق سے بھی دست بردار ہو جاتا ہے اور صرف اپنے فرائض ہی کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختصر ترین الفاظ میں دنیا کے سب سے بڑے مظلوم طبقے کی دادرسی کر دی اور معاشرے کے بنیادی و اہم مسئلے کا حل بھی

پیش کر دیا۔ طبقۂ نسواں جو صرف عرب ہی میں نہیں دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک میں مرد کی بالا دستی اور ظلم و ستم کا شکار تھا۔ چودہ سو برس گزر جانے پر آج بھی خوشگوار عائلی زندگی کا یہی حل ہے کہ مرد و زن ایک دوسرے کے حقوق کو سلب نہ کریں۔ جس معاشرے میں مرد و زن نے ایسا کیا، وہاں عائلی زندگی دشوار ہو کر رہ گئی ہے۔ یورپ و امریکہ وغیرہ جہاں آزادیِ نسواں کا بڑا چرچا ہے، اِس معاملے میں افراط و تفریط کا شکار ہیں، جس کا نتیجہ طلاق، علیحدگی اور اولادِ حرام کی کثرت میں ظاہر ہوا ہے، اور یہ سب اس لیے ہے کہ مذکورہ ممالک میں خوفِ خدا جیسی کوئی شے باقی نہیں رہی۔

(۹) مسلمانوں کے جان و مال کو ایک دوسرے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسی طرح مقدس و محترم قرار دے دیا، جیسا کہ حج کا دن۔ اب ایک مسلمان کا دوسرے کے مال پر ہاتھ ڈالنا یا اُسے قتل کرنا، مکہ مکرمہ، ذوالحجہ اور حج کے دن کے تقدّس کو پامال کرنا قرار پایا۔ حضورؐ کے اِس حکم سے قتل و غارت گری اور ڈاکہ زنی جرم قرار پائی اور اِس طرح چھوٹی چھوٹی خانہ جنگیوں، ایک قبیلے کی دوسرے کی غارت گری اور راہ چلتے مسافروں پر ڈاکہ زنی کا خاتمہ ہو گیا، اور عرب جہاں کسی کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت نہ تھی، امن و سکون کا گہوارہ بن گیا۔

مسلمان کے جان و مال کی یہ حُرمت عرب تک ہی محدود نہ رہی، بلکہ اسلام دنیا میں جہاں جہاں پھیلتا چلا گیا، وہاں وہاں حضورؐ کا یہ فرمان قانون بنتا چلا گیا۔ مسلمانوں نے جہاں اور جب بھی حضورؐ کے اِس قول سے روگردانی کرتے ہوئے ایک دوسرے کے مال پر ہاتھ ڈالا اور ایک دوسرے کے خلاف تلوار اُٹھائی، وہیں اُن پر تباہی و بربادی نازل ہوئی۔ اس کی تازہ ترین مثال ایران و عراق کی کئی برس کی جنگ ہے، جس سے ان دونوں ممالک نے نہ صرف بے پناہ مالی نقصان ہی اٹھایا ہے بلکہ لاکھوں گھرانوں کے چراغ بھی گُل کر

دیئے ہیں۔

(۱۰) آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر صاف صاف الفاظ میں یہ بات واضح کر دی کی گمراہی سے بچنے کے لیے کتاب اللہ (قرآن) پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ مسلمان اگر قرآن کے احکام کو بجا لاتے رہیں گے تو وہ گمراہی سے بچے رہیں گے۔

اسلام کی چودہ سو برس کی تاریخ اِس بات کی گواہ ہے کہ جب تک اور جہاں جہاں مسلمان قرآن کے احکام کی پابندی کرتے رہے، گمراہی سے بچے رہے، لیکن جب اور جہاں کہیں بھی اُنھوں نے احکامِ قرآنی سے روگردانی کی، گمراہی و ضلالت میں جا پڑے۔ اُن کے معاشرے میں طرح طرح کی برائیوں نے گھر کر لیا اور ان کی وسیع و عظیم سلطنتوں پر غیر مسلموں نے قبضہ کر لیا، اور وہ ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے۔ سپین اور ہندوستان کی عظیم اسلامی ریاستوں کا زوال اور اُن پر عیسائیوں کا قبضہ اس کی بیّن مثالیں ہیں۔ عیسائیوں کے قبضے کے بعد ان ممالک میں مسلمانوں پر جو گزری اور انھیں جس ذلت و رسوائی کا سامنا ہُوا، وہ الگ ایک طویل داستانِ رنج والم ہے۔

(۱۱) قبل از اسلام اور پھر ظہورِ اسلام کے بعد جب تک وارثت کے احکام نازل نہ ہوئے تھے، لوگ اپنے مال و جائداد کی تقسیم سے متعلق طرح طرح کی وصیّتیں کیا کرتے تھے، جس سے بعض حق داروں کا حق رہ جاتا تھا اور بعضوں کو حق سے زیادہ مل جاتا تھا یا غیر حق دار، حق دار بن جاتے تھے۔ قرآن نے اِس بارے میں دوٹوک فیصلہ کر دیا، تو اب کسی مسلمان کا ورثا کے بارے میں وصیّت کرنا جائز نہ رہا۔ یہ اُصولی بات تھی، جو آپؐ نے فرمائی کہ قانونِ الٰہی کی موجودگی میں، مسلمانوں کے لیے کوئی دوسرا قانون اُس کی جگہ نہیں لے سکتا۔

(۱۲) ظہورِ اسلام سے قبل اور اُس کے بعد بھی کُفّار و مشرکینِ عرب میں زنا اور بے حیائی عام تھی اور کسی عورت کے بطن سے پیدا ہونے والے لڑکے کو اپنا

کہہ دینا، گویا اپنی مردانگی کا ڈھنڈورا پیٹنا تھا، لیکن یہ انتہائی بے حیائی کے ساتھ ساتھ عورت کی عزت و عصمت کو سر بازار رسوا کرنے والی بات تھی۔ اِس لیے حیائی کا سدِباب یہ کہہ کر دیا گیا "لڑکا اُس کا ہے، جس کے بستر پر پیدا ہوا" اور غیر مرد جو اُس لڑکے کے اپنا ہونے کا دعویٰ کرے، وہ گویا زنا کاری کا اقرار کر رہا ہے، جس کے لیے سنگسار کئے جانے کی سزا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ وہ لڑکا واقعی اپنے باپ کے نطفے سے ہے یا نہیں، تو یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ ہر ڈھکی چھپی بات کا خوب جاننے والا ہے، جس کے حضور ہر انسان کے اعمال کو پیش کیا جانا ہے اور جو اچھے بُرے اعمال کے حساب سے سزا و جزا کا دینے والا ہے۔ اس کے برعکس لڑکا اگر اپنے آپ کو باپ کے علاوہ کسی اور کے نسب سے ہونے کا دعویٰ دار ہے، تو وہ اللہ کی لعنت کا مستحق ہے کہ خود ہی اپنے آپ کو حرامی قرار دے رہا ہے، اور اِسی طرح وہ غلام بھی لعنت کا مستحق ہے، جو غلام تو کسی شخص کا ہے مگر اپنی نسبت کسی اور سے قائم کر رہا ہے اور اس طرح نہ صرف یہ کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے بلکہ اپنے مالک سے انحراف کر کے فتنہ و فساد کو برپا کر رہا ہے۔

(۱۳) عورت اپنے شوہر کا مال اپنی مرضی سے اگر لوگوں کو دینے لگے تو اِس سے گھریلو زندگی میں فساد کی بنیاد پڑتی ہے، لہٰذا حضورؐ نے اِس بات کی مُمانعت کر دی کہ کوئی عورت اپنے شوہر کے مال کو اُس کی مرضی کے بغیر کسی کو دے۔ حضورؐ نے اِس کے ساتھ چند اور باتوں کی بھی صراحت کر دی کہ قرض دار کا قرض لوٹانا فرض ہے اور اِس طرح جو شخص کسی کا ضامن بنتا ہے اور وہ وقت اور وعدے پر پورا نہیں اُترتا تو پھر ضامن کو ضمانت بھرنا ہوگی۔

(۱۴) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو مذہب میں غلو و مبالغے سے بچنے کو کہا کہ ایسا کرنا مذہب یا دین کو مسخ کر دینا ہے اور جب کوئی دین ہی مسخ ہو جائے تو ظاہر بات ہے، اُس کے پیروکار اصل کے نہیں، مسخ شدہ دین کے ماننے والے ہوں گے، جو صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے ہوں گے اور جو صراطِ مستقیم

سے ہٹے یقیناً بربادی اُن کا مقدر ہوئی۔

(۱۵) حج کے مسائل کو سیکھ لینے کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے تاکید فرما دی کہ (انہیں اس بات کی اشارۃً خبر ہو چکی تھی یہ اُن کا آخری حج بیت اللہ ہے) کل کو مسلمانوں کو یہ جاننے کی ضرورت پیش آنے والی تھی کہ حضورؐ نے حج کا فلاں فلاں رکن کس طرح ادا کیا تھا۔

(۱۶) حضورؐ نے اِس حقیقت کا اظہار بھی فرمادیا کہ ابتدائے آفرینش کے بعد زمانہ بہت سے تغیّر و تبدّل سے گزرتا ہُوا، آج پھر ابتدائے آفرینش ہی کے مقام پر آگیا ہے۔ حضورؐ کے اِس قول پر ذہن میں اِس سوال کا پیدا ہونا بعید از قیاس نہیں کہ زمانہ ۹، ذوالحجہ ۱۰ھ کو پھر سے کیونکر آغازِ آفرینش کے مقام پر لوٹ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس قول سے بظاہر جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش کے وقت زمانہ دینِ فطرت پر تھا، اُس میں کسی قسم کی کوئی بھی کجی نہ تھی اور آج جب کہ پھر اللہ نے دینِ فطرت یعنی اسلام کو مکمل کردیا ہے تو گویا زمانے کو اُس کی اصل پر لوٹا دیا ہے۔

(۱۷) عرب چونکہ اپنی ضرورت کے پیشِ نظر قابلِ احترام مہینوں میں ردّ و بدل کرلیا کرتے تھے، اِس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار پھر ذوقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب کے قابلِ احترام مہینوں کی نشان دہی کردی تاکہ اُن میں ردّ و بدل کی گنجائش باقی نہ رہے۔

(۱۸) حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مسلمانوں کی جان و مال و آبرو کی حُرمت و اہمیّت کے پیشِ نظر اپنا یہ قول عرفات کے خطبے کے بعد منیٰ کے خطبے میں بھی دُہرایا جس کا تذکرہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی تشریح میں نمبر ۹ کے تحت کر آئے ہیں۔

(۱۹) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اِس بات کی تاکید فرما دی کہ جس طرح اب میری موجودگی میں ایک دوسرے کی جان و مال و آبرو پر ہاتھ ڈالنے سے

رکے ہوئے ہو، میرے بعد بھی اسی طرح رکے رہنا۔ میری موجودگی سے زیادہ تمہیں اللہ کی ہمہ وقت موجودگی کا خیال رہنا چاہیئے کہ جس کے حضور تمہیں ایک دن حاضر ہونا ہے اور جہاں تمہارے اعمال کی باز پرس ہوگی۔

(۲۰) یہود کا عقیدہ تھا اور ہے کہ باپ کے گناہ کی سزا، اُس کا بیٹا بھی بھگتتا ہے اور اِس طرح ہندو مسئلہ آواگون کو مانتے ہوئے اِس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان اپنے گناہوں کی سزا جُون بدل بدل کر مسلسل بھگتتا چلا جاتا ہے۔ تا وقتیکہ کہ اُس کی مُکتی نہیں ہو جاتی اور عیسائی اِس عقیدے کے ماننے والے ہیں کہ یسوع مسیحؑ نے سولی پر لٹک کر تمام عیسائیوں کے گناہوں کا کُفّارہ ادا کر دیا ہُوا ہے، لیکن اِن سب عقائد کے برعکس اسلام صرف مجرم ہی کو جرم کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ باپ کے جرم کی ذمہ داری کسی طرح بھی بیٹے پر عائد نہیں ہوتی اور نہ بیٹے کے جرم کے لیے باپ کو ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے، حضورؐ کے اِس فرمان نے یہودیت، عیسائیت اور ہندومت کے ایسے تمام عقائد کو باطل ٹھہرا دیا، جو مجرم کے علاوہ اُس کے کسی اور رشتہ دار کو اُس کے جرم کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے، صرف اِس لیے کہ وہ اُس کا باپ، بیٹا یا بھائی وغیرہ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس فرمان نے عربوں میں رائج انتقامِ خون کے رواج کی بھی جڑ کاٹ کر رکھ دی، جس نے عرب معاشرے میں ہمیشہ سے فتنہ و فساد برپا کئے رکھا تھا، کیونکہ انتقامِ خون تھا کہ نسل در نسل چلتا تھا اور اس کا سلسلہ ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔

(۲۱) امیر کی اطاعت کے لیے حضورؐ نے صرف یہ شرط عائد کی کہ وہ اللہ کی کتاب کے مطابق لے چلنے والا ہو اگر وہ ایسا کرنے والا ہے تو پھر اُس کی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے، چاہے وہ عربی ہو یا ایرانی، شرقی ہو یا غربی، گورا ہو یا کالا، خوب رو ہو یا نکٹا غلام۔ گویا امیر کی اطاعت اُس

وقت ضروری نہیں جب وہ مسلمانوں کو اللہ کے احکام کے خلاف چلنے کو کہے۔

(۴۲) حضورؐ کی یہ پیش گوئی تھی کہ مکہ مکرمہ میں اب قیامت تک شیطان کی پرستش نہ ہوگی، یہ پیش گوئی چودہ سو برس سے سچی ثابت ہورہی ہے کہ فتح مکہ کے بعد سے پھر کسی بھی دور میں خانۂ خدا میں کسی بُت کی پرستش نہیں کی گئی، وہاں صرف اور صرف اللہ کی پرستش ہوئی ہے اور اُسی کا نام بلند ہوا ہے ہاں البتہ مکہ میں اب بعض باتوں میں شیطان کی پیروی ہونے لگی ہے کہ مکہ کے خاص گھرانوں میں وی، سی، آر، پر عریاں اور نیم عریاں یورپی، امریکی اور ہندی فلمیں دیکھی جانے لگی ہیں۔ عربوں میں شرم وحیا کی کمی ہوگئی ہے، جس نے طرح طرح کی سماجی برائیوں کو جنم دیا ہے اور یہ برائیاں عرب کے دوسرے شہروں کی طرح مکہ مکرمہ میں بھی نظر آنے لگی ہیں۔ برائی کے یہ کام یقیناً شیطان کی پیروی ہیں، جو اُس کی خوشی کا باعث ہیں۔

(۴۳) آخر میں حضورؐ نے مسلمانوں کو بخشش اور جنت کے حصول کا ایک آسان نسخہ تجویز کردیا کہ "اللہ کی پرستش کرو، نمازِ پنجگانہ ادا کرو، ہر برس رمضان کے روزے رکھو اور میری اتباع کرو اور تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

ان احکام کا اعلان کرنے کے بعد، جیسے عرفات کے میدان میں حاضرین کو حضورؐ نے گواہ بنایا تھا، ویسے ہی منیٰ میں بھی مجمعِ عام سے پیغام خداوندی کے سنا دینے کی شہادت لی اور اُس پر اللہ کو گواہ بنایا، اور سننے والوں سے کہہ دیا کہ وہ اُن کو سنا دیں، جو موجود نہیں ـــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پیغام، صحابہ کرام نے عام کیا، تابعین اور تبع تابعین نے اُسے پھیلایا اور پھر اُن سے اور سننے والوں کے ذریعے کتبِ احادیث سے بعد میں آنے والے مسلمانوں کو پہنچتا چلا آیا اور انشاء اللہ تا قیامت پہنچتا چلا جائے گا۔

حضورؐ کے حجۃ الوداع ۱۰ھ کے خطباتِ عرفات ومنیٰ میں سے یہ وہ

اقتباسات ہیں جو ہم تک مختلف کتبِ احادیث سے پہنچے ہیں ۔ جنہیں اسلامی تعلیمات کا خلاصہ اور عطر کہا گیا ہے، اور بے شک یہ ایسا ہی ہے کہ آقائے دوجہاں کے اِن فرمودات پر عمل پیرا ہو کر عرب جیسی قبیلہ در قبیلہ منتشر، غیر متمدن، غیر مہذب، اصنام پرست، شراب، زنا اور جوئے کی رسیا اور طرح طرح کے اوہام میں مبتلا، فاقہ مست قوم ایک متحد، متمدن و مہذب، خدائے واحد کی پرستار، شراب، زنا اور جوئے سے مکمل اجتناب برتنے والی بہادر و دلیر قوم بن کر اُبھری اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس زمانے کی ایران و روم جیسی ظالم و جابر سوپر طاقتوں کو ملیا میٹ کر دیا۔

یہ درست ہے کہ صفحۂ ہستی پر قومیں اور بھی اُبھریں، ممالک اُنہوں نے بھی فتح کیے ہوں لیکن تاریخ انسانی میں ایسی مثال ملنا مشکل ہے کہ اتنی مختصر مدت میں کوئی دوسری قوم، جو عربوں کی طرح قبیلہ در قبیلہ منتشر ہو ایک متحد و مضبوط قوم بن کر اُبھری ہو اور اُس نے اپنے سے تعداد و اسلحہ میں کئی گنا زیادہ اور فنونِ حرب میں کئی درجہ بہتر اور مانی ہوئی جنگجو اقوام کو شکست پر شکست دی اور اُس ظلم و ستم اور جور و جفا سے بھی اجتناب کیا ہو، جو اُس زمانے کی فاتح اقوام کا وطیرہ تھا۔

یہ بھی درست ہے کہ کرۂ ارضی پر مذاہب اور بھی اُبھرے، لیکن مفتوحہ علاقوں میں قبولِ عام کا درجہ حاصل کر کے وہ اتنی تیزی اور ایسی سرعت سے نہیں پھیلے، جیسا کہ اسلام، جس کا سبب اسلام کے پیروکاروں کا اپنے دین سے لگاؤ اور اُس کی تعلیمات پر صدقِ دلی سے عمل تھا، اور دوسرے خود دینِ اسلام کی سادگی، بندے اور اللہ کے درمیان تعلق میں کسی تیسرے واسطہ کی عدم موجودگی تھی، تیسرے بانیِ دین کی حیاتِ طیّبہ تھی، جس کا ہر پہلو صاف، سادہ اور قابلِ تقلید تھا اور چوتھے اُس کتاب کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کا محفوظ ہونا تھا، جس کے پیرو اُسے آسمانی مانتے تھے، اِس کے برعکس ماضی قریب کے مذاہب جو اُن علاقوں میں رائج تھے، اُن سے متعلق صحائفِ سماوی اور بانیِ ادیان کے فرمودات و حالاتِ زندگی امتدادِ زمانہ سے غلط سلط اور مسخ ہو چکے تھے جیسے توریت اور انجیل، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے فرمودات اور حالاتِ زندگی

وغیرہ۔ ایران میں آتش پرستی اور افغانستان و ہند میں بدھ مت و ہندومت میں کفر و شرک کے سوا، اور تھا ہی کیا۔

ملک کے ملک اور سلطنتوں کی سلطنتیں، اسلام کے قدموں میں اگر ڈھیر ہو گئیں تو یہ تیر و تلوار کا کرشمہ نہ تھا بلکہ یہ معجزہ تھا اُس انسانِ کامل اور نبی اکمل ؐ کا، جس نے ایک اَن پڑھ، غیر متمدن، غیر مہذب اور غیر متحد قوم کو علم آشنا، تمدن آفریں، مہذب و متحد قوم بنا دیا، اور یہ سب کچھ اُس نے اُس نورِ مبین کی روشنی میں کیا، جو اُسے اُس ربُّ العالمین نے عطا کیا تھا، جو بدھ کا رب تھا اور موسیٰؑ و عیسیٰؑ کا بھی، اور اُس نے اپنے پیروکاروں میں دین و دنیا کا ایسا توازن قائم کیا، جو دُنیا میں موجود ادیان و مذاہب کے پیروکاروں میں باقی نہ تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں ۱۴ ذلحجہ کو منیٰ سے نکل کر وادیِ محصب میں قیام کیا اور رات وہیں بسر کی، رات کے پچھلے پہر مکہ تشریف لے گئے، کعبہ کا طوافِ وداع کیا، فجر کی نماز مسجد الحرام میں ادا کی اور پھر مہاجرین و انصار کے ساتھ مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں خم غدیر کے مقام پر صحابہ کرام کو اکٹھا کر کے اُن سے مختصراً یوں خطاب فرمایا:

> "حمد و ثنا کے بعد! اے لوگو! میں بھی بشر ہوں۔ ممکن ہے خدا کا فرشتہ آجائے اور مجھے (موت) قبول کرنا پڑے۔ میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں۔ ایک خدا کی کتاب جس کے اندر ہدایت اور روشنی ہے۔ خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو، اور دوسری چیز میرے اہلِ بیت ہیں۔ میں اپنے اہلِ بیت کے بارہ میں تم کو خدا کو یاد دلاتا ہوں"۔ [1]

اِس خطبے کا سبب یہ تھا کہ اثنائے سفر میں "بریدہ اسلمیؓ" نے حضرت علی مرتضیٰؓ کی

---

[1] تاریخ اسلام جلد اوّل ص ۱۱۱

نسبت کچھ شکایات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سمع مبارک تک پہنچائیں۔ شکایات کا تعلق حضرت علی مرتضیٰ کے چند افعال سے تھا، جو حکومتِ یمن میں جناب مرتضوی سے تقسیم غنیمت وغیرہ کے متعلق صادر ہوئے تھے۔ درحقیقت شکایات کی بنیاد بریدہ کا قصورِ فہم تھا۔ اِس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خم غدیر پر ایک فصیح خطبہ پڑھا اور اِس خطبہ میں اہل بیت رضوان علیہم کی شان و منزلت کا اظہار فرمایا اور علی مرتضیٰ سلام اللہ علیہ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا "جس کا میں مولا ہوں۔ علیؓ بھی اُس کا مولا ہے"۔ اِس خطبہ کے بعد عمر فاروقؓ نے علی مرتضیٰ کو اِس شرف کی مبارک باد دی اور بریدہؓ نے بقیہ العمر علی مرتضیٰ کی محبت و متابعت کو پورا کیا۔ بالآخر یہ بزرگوار جنگِ جمل میں شہید ہوئے تھے"۔[1]

مدینہ کے قریب پہنچ کر ذوالحلیفہ (بیر علی) میں شب بسر کی اور طلوعِ آفتاب کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے اور جب شہر نظر آنے لگا تو فرمایا:

"خدا بزرگ و برتر ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں، کوئی اُس کا شریک نہیں، بس اُس کی سلطنت ہے، اُسی کے لیے مدح اور ستائش ہے، وہ ہر بات پر قادر ہے۔ لوٹے آرہے ہیں توبہ کرتے ہوئے، فرمانبردارانہ، زمین پر پیشانی رکھ کر، اپنے پروردگار کی مدح و ستائش میں مصروف ہوکر، خدا نے اپنا وعدہ سچا کیا، اپنے بندہ کی نصرت کی اور تمام قبائل کو تنہا شکست دی"۔

حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات کے میدان میں قرآن کی یہ آیت اُتری، جسے آپ نے ایک لاکھ فرزندانِ توحید کو سنا دیا تھا کہ:

"آج کے دن میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کردیا اور اپنی نعمتیں پوری کردیں"۔

ساتھ ہی آپؐ نے یہ اعلان بھی فرمادیا تھا کہ "مجھے اُمید نہیں کہ آئندہ سال تم سے مل

---

[1] رحمۃ للعالمین حصہ اول ص ۲۴۳

سکوں"۔ خم غدیر کے خطبہ میں بھی آپؐ نے صحابہ کرام کو مطلع فرمایا تھا کہ "اے لوگو! میں بھی بشر ہوں، ممکن ہے کہ خدا کا فرشتہ جلد آجائے اور مجھے قبول کرنا پڑے (یعنی موت)"۔

حضورِ پر نورؐ کے یہ سب فرمان اِس بات کی نشان دہی کر رہے تھے کہ ۲۰/۲۲/ اپریل ۵۷۱ء کو کفر و شرک میں ملوث، وحشت و درندگی میں مبتلا، شراب و کباب میں مست، اِس جہانِ تیرہ و تار پر جو ماہِ منیر، بدرِ کامل، نیّرِ درخشاں اور آفتاب عالمتاب طلوع ہوا تھا، وہ اب اِس دنیا کو الوداع کہنے والا ہے۔ حجۃ الوداع سے قبل رمضان میں آپؐ دس کی بجائے بیس دن اعتکاف میں بیٹھے تھے اور اب کے رمضان میں آپؐ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ایک کی بجائے دو بار قرآنِ حکیم سنا تھا۔

حجۃ الوداع سے واپسی کے بعد آپؐ شہدائے اُحد کے مزارات پر تشریف لے گئے اور اُن کے لیے دُعائے خیر فرمائی اور اس رقت آنگیز طریقہ سے ان کو وداع کیا کہ "جس طرح ایک مرنے والا اپنے زندہ اعزّہ کو وداع کرتا ہے"۔[1]

شہدائے اُحد کے لیے دعائے خیر کرنے کے بعد لوٹے اور آپؐ نے صحابہ کرام سے مسجد میں یوں فرمایا:

> "میں تم سے پہلے حوض پر جا رہا ہوں، اُس کی وسعت اتنی ہے جتنی ایلہ سے جحفہ تک۔ مجھ کو تمام دنیا کے خزانوں کی کنجی دی گئی ہے مجھے خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم شرک کرو گے، لیکن اس سے ڈرتا ہوں کہ دنیا میں نہ مبتلا ہو جاؤ اور اِس کے لیے آپس میں کشت و خون نہ کرو، تو پھر اسی طرح ہلاک ہو جاؤ، جس طرح تم سے پہلی قومیں ہلاک ہوئیں"۔[2]

۱۱ھ ۱۸ یا ۱۹ صفر کو آپؐ آدھی رات کو جنت البقیع میں (جو مسلمانوں کا

---

[1] سیرت النبی جلد دوم ص ۲۱۲-۲۱۱

[2] سیرت النبی جلد دوم ص ۲۱۲-۲۱۱

قبرستان ہے) تشریف لے گئے، وہاں سے واپسی پر مزاج ناساز ہوا۔ علالت کے دوران میں پانچ دن آپؐ نے مختلف ازواج کے گھروں میں گزارے اور جب مرض شدت اختیار کر گیا تو بقیہ آٹھ روز آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے گھر پر گزارے۔ اُم المومنین حضرت عائشہؓ کا گھر مسجدِ نبوی سے مُلحق تھا، اور اُس کا دروازہ مسجد میں کھلتا تھا۔ جب تک آمدورفت کی قوت رہی، آپؐ امامت فرماتے رہے۔ اُن ہی دنوں میں ایک دن آپؐ نے آخری نماز جو پڑھائی، وہ مغرب کی تھی۔ عشار کی نماز کے لیے تین بار ارادہ فرمایا مگر ہر بار غشی طاری ہو گئی تو فرمایا کہ ابوبکرؓ نماز پڑھائیں۔

وصال سے چار دن قبل (جمعرات) کے دن ظہر کے وقت آپ کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو آپؐ نے حکم دیا کہ مجھ پر پانی کی سات مشکیں ڈالی جائیں۔ غسل کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ تھام کر آپؐ کو مسجد میں لائے۔ جماعت کھڑی ہو چکی تھی اور حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ آہٹ پا کر وہ پیچھے کو ہٹے تو آپؐ نے اشارے سے روکا اور اُن کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھائی یعنی آپؐ کو دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ کر اور لوگ ارکان ادا کرتے جاتے تھے۔ نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا، جو آپؐ کی زندگی کا آخری خطبہ تھا، آپؐ نے فرمایا: [1]

"خدا نے اپنے بندے کو اختیار عطا فرمایا ہے کہ خواہ وہ دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے یا خدا کے پاس (آخرت میں) جو کچھ ہے اِس کو قبول کرے، لیکن اُس نے خدا ہی کے پاس کی چیزیں قبول کیں۔ سب سے زیادہ میں جس کی دولت اور صحبت کا ممنون ہوں، وہ ابوبکرؓ ہیں، اگر میں دُنیا میں کسی کو اپنی اُمت میں سے اپنا دوست بنا سکتا تو ابوبکرؓ کو بناتا، لیکن اسلام کا رشتہ دوستی کے لیے کافی ہے۔ مسجد کے رخ کوئی دریچہ ابوبکرؓ کے دریچے کے سوا باقی نہ رکھا جائے۔ ہاں تم سے پہلی قوموں نے

---

[1] سیرت النبی جلد دوم صـ ۲۲۲-۲۲۱

اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا ہے دیکھو تم ایسا نہ کرنا میں منع کرجاتا ہوں۔"

" اے لوگو! میں انصار کے معاملے میں تم کو وصیت کرتا ہوں۔ عام مسلمان بڑھتے جائیں گے لیکن انصار اس طرح کم ہو کر رہ جائیں گے، جیسے کھانے میں نمک وہ اپنی طرف سے اپنا فرض ادا کر چکے، اب تمہیں اُن کا فرض ادا کرنا ہے۔ وہ میرے (جسم میں بمنزلہ) معدہ کے ہیں، جو تمہارے نفع و نقصان کا متولی ہو (یعنی جو خلیفہ ہو) اُس کو چاہیے کہ اُن میں جو نکوکار ہوں، اُن کو قبول کرے، اور جن سے خطا ہوئی۔ اُن کو معاف کرے۔"[1]

" حضورؐ کو مرض کے آخری ایام میں ایک دن یہ یاد آیا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں۔ دریافت فرمایا کہ " عائشہ! وہ اشرفیاں کہاں ہیں؟ محمدؐ خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا، جاؤ! اُن کو خدا کی راہ میں خیرات کر دو!"[2]

دو شنبہ (پیر) یکم ربیع الاوّل[3] دو شنبہ (پیر) ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ[4] (۸۔جون ۶۳۲ء) کو فجر کے وقت آپؐ نے اپنے گھر کے دروازے پر لٹکتا ہوا پردہ اُٹھا کر مسجد میں جھانکا، صحابہ نماز میں مشغول تھے۔ دیکھ کر مسرت سے ہنس پڑے۔ صحابہ نے آہٹ پا کر خیال کیا کہ آپؐ باہر تشریف لا رہے ہیں۔ فرطِ مسرت سے صحابہ بے قابو سے ہو گئے اور قریب تھا کہ نمازیں ٹوٹ جائیں (حضرت ابوبکرؓ نے جو امام تھے، چاہا کہ پیچھے ہٹ جائیں) آپؐ نے اشارے سے روکا اور دروازہ کا پردہ ڈال دیا یہ سب سے

۱؎ سیرت النبی جلد دوم ص ۲۲۳

۲؎ سیرت النبی جلد دوم ص ۲۲۵

۳؎ سیرت النبی جلد دوم حاشیہ ص ۲۱۶

۴؎ رحمۃ للعالمین حصہ اوّل ص ۲۵۱ تاریخ الامت جلد اوّل ص ۲۳۶

آخری موقعہ تھا کہ صحابہ نے جمالِ نبوی کی زیارت کی۔ حضرت انسؓ بن مالک فرماتے ہیں کہ "آپؐ کا چہرہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ مصحف کا کوئی ورق ہے"۔ یعنی سپید ہو گیا تھا۔

دن جیسے جیسے چڑھتا چلا گیا، آپؐ پر بار بار غشی طاری ہونے لگی۔ حضورؐ کی یہ بے چینی دیکھ کر حضرت فاطمہ زہراؓ نے کہا "ہائے میرے باپ کی بے چینی"، آپ نے جواباً فرمایا "تمہارا باپ آج کے بعد بے چین نہ ہوگا"۔ اِس حالت میں آپ کی زبان سے بار بار یہ الفاظ ادا ہوتے تھے۔

"اُن لوگوں کے ساتھ جن پر خدا نے انعام کیا
اب کوئی اور نہیں بس وہی رفیق درکار ہے"۔

اِس دارِ فانی کو چھوڑنے سے ذرا پہلے حضرت ابوبکرؓ کے لڑکے عبدالرحمٰن جب بہن کے گھر داخل ہوئے تو اُن کے ہاتھ میں مسواک تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر جما کر مسواک کو دیکھنے لگے تو حضرت عائشہؓ نے خیال فرمایا کہ حضورؐ مسواک کرنا چاہتے ہیں۔ عبدالرحمٰن سے مسواک لے کر دانتوں سے نرم کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کی، آپؐ نے ایک صحت مند شخص کی طرح مسواک کی اور پھر سینے میں سانس کی گھرگھراہٹ ہوئی، آپ نے فرمایا "نماز اور غلام"۔ پاس ہی پانی کی لگن رکھی تھی، اِس میں بار بار ہاتھ ڈالتے اور چہرے پر ملتے، اسی دوران میں ہاتھ اُٹھا کر انگلی سے اشارہ کیا اور تین بار فرمایا:

"اب اور کوئی نہیں، بس وہی بڑا رفیق درکار ہے"۔ یہی فرماتے آپ کی روحِ پاک عالمِ قدس میں پہنچ گئی۔

یہ قریباً سہ پہر، پیر کا دن تھا۔ تجہیز و تکفین دوسرے دن منگل کو عمل میں آئی۔ غسل وغیرہ کی سعادت خاص رشتہ داروں حضرت علیؓ، فضل بن عباسؓ، اور اسامہ بنؓ زید کے حصہ میں آئی۔ حضرت ابوطلحہؓ نے قبر کھودی، کفن تین سفید سوتی کپڑوں کا دیا گیا۔

حضرت ابوطلحہؓ نے مدینہ کے رواج کے مطابق قبر کھودی جو مکہ کے رواج کے خلاف لحدی یعنی بغلی تھی۔ غسل دیئے جانے کے سبب زمین چونکہ نم تھی، اِس لیے جس بستر پر آپؐ نے وفات پائی، وہی قبر میں بچھا دیا گیا۔

کمرہ جس میں حضرت عائشہ رہتی تھیں، بڑا کمرہ نہ تھا، اِس لیے تھوڑے تھوڑے لوگ اندر جاتے تھے اور بغیر امام کے نمازِ جنازہ ادا کرتے تھے۔ پہلے مردوں، پھر عورتوں اور پھر بچوں نے نمازِ جنازہ پڑھی۔ جسدِ اطہر کو حضرت علیؓ، فضل بن عباسؓ، اسامہؓ بن زید اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے قبر میں اُتارا۔

آج وہ نبیِ آخر الزمان و نبیِ اکملؐ، جس کی آمد کی خبر انبیاء علیہم السلام صدیوں سے مسلسل دیتے آئے تھے، بنی نوعِ انسان کو اللہ کا آخری پیغام پہنچا کر دنیا سے رخصت ہُوا۔ اُسے رخصت تو ہونا ہی تھا کہ وہ انسان تھا اور اِس دنیائے فانی سے رخصت ہر انسان کا مُقدّر ہے، لیکن جو کچھ اُس نے چھوڑا، وہ کسی بھی انسان کا مُقدر نہ تھا اور نہ ہوگا۔ اُس کی چھوڑی ہوئی کتاب قرآن ہے، جو دنیائے اسلام کے لیے مشعلِ راہ ہے ہی، لیکن غیر اسلامی دنیا کے لیے بھی وہ اک ایسا منارۂ نور ہے، جو ہر اُس بھٹکے ہوئے کو راہِ راست و راہِ فلاح و نجات دکھاتا ہے، جو اُس کی طرف رجوع کر لیتا ہے اور جو اُس کی طرف رجوع نہیں کرتا وہ مسخ شدہ ادیان اور ظن و تخمین پر مبنی مختلف فلسفہ ہائے حیات کی کج و تاریک راہوں میں زندگی بھر بھٹکتا بھٹکتا ایک دن موت کے اندھیاروں میں گم ہو جاتا ہے۔

آج وہ انسانِ کاملؐ، انسانیت کو معراج سے روشناس کرا کے رخصت ہُوا، جس کی آمد سے قبل کوئی بھی انسان نہ تو اُس سا کامل و اکمل ہُوا، اور نہ انسانیت ہی پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ تاریخِ عالم اِس بات کی گواہ ہے کہ جو اوصافِ کاملہ اِس انسانِ کاملؐ کی ذاتِ گرامی میں تھے، اُن سے کوئی بھی مُتّصف نہ تھا۔ اُس کی شرافت و نجابت، صداقت و امانت، دیانت و امامت پر اُس کے انتہائی مخالف بھی گواہ ہیں۔ اُس کے صبر و تحمل، برداشت و بردباری، شفقت و رحمدلی پر مکہ کے مُتمرّد اور طائف کے سنگ دل مشرک و کافر شاہد ہیں۔ اُس کی بہادری و دلیری، جوانمردی و ثابت قدمی پر بدر، اُحد اور حنین کے میدان ہائے کارزار شہادت دیتے ہیں۔ اُس کے صبر و قناعت اور فقر و فاقہ پر اُس کے سینکڑوں پیروکار چشم دید گواہ ہیں، جنہوں نے

پیٹ پر پتھر باندھے اُسے خود دیکھا اور اُس کے اندھیرے گھروں کے سرد چولہوں کو وہ بخوبی جانتے تھے۔

آج وہ نبی اکمل رخصت ہُوا، جس کی آمد سے قبل تاریخِ عالم کی جھولی ایسے انسانِ کاملؐ سے خالی تھی۔ یہ وہ انسانِ کاملؐ ہے، جس نے تاریخ کی جھولی امن و آشتی، عدل و انصاف، عفو و رحم، انسانی مساوات اور عظمتِ آدم جیسی صفاتِ عالیہ سے بھری۔ یہ اُس کی ایسی واضح و روشن نشانیاں ہیں کہ کوئی بھی انسان، جب بھی چاہے، تعصّب و تنگ نظری کی عینک اُتار کر تاریخِ عالم میں ان صفاتِ عالیہ سے متّصف اُس انسانِ کاملؐ کے خدوخال، چال ڈھال، بول چال، طور طریقے، رہن سہن، عادات و اطوار، نشست و برخاست، سفر حضر، غرض کہ اُس کے ایک ایک نقشِ قدم کو پا سکتا ہے اور چاہے تو اُس انسانِ کاملؐ کے نقشِ پا پر چل کر خود بھی اک انسانِ اعلیٰ بن سکتا ہے۔

افسوس تو اِس بات کا ہے کہ یورپ کے نام نہاد اکثر دانشوروں، سوانح نگاروں، اور تاریخ نویسوں نے جب بھی اُسے دیکھنے کی کوشش کی ہے، اپنی آنکھوں پر عیسائیت و یہودیت و اشتراکیت کے تعصّب کی عینک چڑھا کر دیکھا ہے اور اُنہوں نے اس ارادے سے قلم اُٹھایا ہے کہ وہ اُسے گھٹا کر پیش کریں گے، جس کا ذکر اللہ نے بلند کیا ہے، وہ اُسے (نعوذ باللہ) ظالم و سفاک کہیں گے، جسے اللہ نے رحمۃٌ للعالمین بنا کر بھیجا۔ وہ اُسے جنگ جُو ثابت کریں گے، جو ساری زندگی اپنے پیروکاروں اور اللہ کے پسندیدہ دین کا دفاع کرتا رہا اور اللہ کی مخلوق کو صراطِ مستقیم دکھاتا رہا۔ وہ اُسے جنگ باز ٹھہرائیں گے، جس کو تباہ و برباد کرنے کے لیے عرب کے اکثر و بیشتر قبائل نے بار بار اُس پر حملے کیے، جس کے دین کو مٹانے کے لیے مدینہ و خیبر اور اُن کے گرد و نواح میں بسنے والے یہود نے مسلسل سازشیں کیں اور کفارِ عرب کو ساتھ ملا کر اُسے تہ تیغ کر دینا چاہا۔ وہ اُسے حملہ آور کہیں گے، جسے شام سے یورپ تک پھیلی ہوئی سلطنت کے والی قیصر نے اپنے ماتحت غسّانی عیسائی عربوں سے مٹا

دینا چاہا۔ وہ اُسے سلطنت کسریٰ کا مٹا دینے والا کہیں گے، جسے ایران کے شہنشاہ خسرو پرویز نے پابازنجیر کر کے اپنے دربار میں پیش کرنے کا حکم جاری کیا۔

صد افسوس ہے اُن مسلمان سیرت نگاروں اور تاریخ نویسوں پر جنہوں نے اپنے جوشِ عقیدت اور زورِ قلم کو اِس غیر محتاط اور غلط طریقے سے استعمال کیا کہ اُس کی اور اُس کے پیروکاروں کی دفاعی مہموں کو سرایا و غزوات کے بیسیوں نام دے ڈالے، جسے یورپ نے جنگیں کہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے صحابہ کرامؓ کو جنگ جُو اور جنگ باز کے نام دے ڈالے۔ ہمارے اسلاف کی کتب سرایا و غزوات کی دلچسپ داستانوں سے بھری رکھی ہیں، جن کی حقیقت صرف اور صرف اتنی ہے کہ وہ عرب کے مختلف قبائل و یہود کی دراز دستیوں اور قتل و غارت گری کی تیاریوں کو روکنے کی تدابیر تھیں اور اُن کے وحشیانہ حملوں سے مدینہ کو بچانے کی پیش بندیاں تھیں۔

صد ہزار افسوس ہے اُن گمراہ مسلمانوں پر جو مارکس اور لینن کے نام نہاد چیلے چانٹے بنے اسلام کو سرمایہ داروں کا پشتیبان دین قرار دیتے ہیں اور اسلامی مفکروں اور دانش وروں کو رجعت پسند قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح ظاہر و باہر ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا انقلابی، جس نے غلاموں کو آزادوں کی صف میں لا کھڑا کیا، جس نے مردوں کی برتری کو ختم کر کے دنیا کی نصف آبادی کو برابر کے حقوق دلائے، جس نے پرولتاری طبقے کو سرمایہ داروں کے سود کے آہنی شکنجے سے نجات دلائی، جس نے دولت مندوں پر شراب و زنا و اسراف کو حرام کر کے دولت کو انسانوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کرنے کی بار بار سختی سے ہدایت کی، وہ نبی آخر الزماںؐ، سرورِ دو عالمؐ، رحمۃ للعالمینؐ، حضور پُر نورؐ، محمد مصطفےٰؐ، احمدِ مجتبیٰؐ کی ذاتِ گرامی ہے، جن پر لاکھوں سلام اور کروڑوں درود کہ وہ ایسے انسانِ کاملؐ تھے، جن کی تعریف و توصیف، تحسین و تکریم سے ہر لکھنے والے کا قلم بے بس و مجبور ہے، چاہے وہ مجھ سے کم علم کا ہو یا علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، احمد شاہ خاں بریلوی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے عالموں کا، لیکن اپنے آقا کی تعریف و توصیف، عزت و تکریم تو ہر غلام مصطفےٰؐ پر فرضِ عین ہے کہ

یہ قرض و دین ہے، کیونکہ وہی انسانِ کامل و نبی اکمل ہیں، جنہوں نے تیرہ و تار دنیا کو شاہراہِ نور و ہدایت پر ڈالا اور بنی نوعِ آدم کو مقامِ آدمیت سے روشناس کرایا اور انسان کو بتایا کہ وہی ہے، جو اللہ کی ہر مخلوق سے ارفع و اعلیٰ ہے اور اُسے اپنے اعلیٰ و ارفع ہونے کا ثبوت اس طرح دینا ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ پر جبرئیل علیہ السلام بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ آپ کا مقام تو وہ ہے، جہاں میرے بھی پر جل جائیں گے، الحمد للہ رب العلمین صلوٰۃ و سلام علی خاتم النبیین۔

دنیا میں جاہ اور آخرت میں پناہ کے لئے

ہماری خوبصورت کتب

- نبی اکرمؐ کاشانۂ نبوی میں ——— علی اصغر چودھری
- سیرت طیبہ۔ (صدارتی ایوارڈ یافتہ) ——— پروفیسر غلام ربانی عزیز
- نبی کریمؐ کے سفر مبارک ——— محمد کلیم آرائیں
- رسول اکرمؐ کی انقلابی سیرت ——— مولانا اخلاق حسین قاسمی
- سیرت حضرت ابوذر غفاریؓ ——— ابن عبدالشکور
- حضرت ابوبکر صدیقؓ (غیر مسلموں کی نظر میں) ——— عبدالصبور طارق
- عثمانی ترکوں کی تاریخ ——— عبدالصبور طارق
- پلٹ آؤ اپنے رب کی طرف ——— علی اصغر چودھری
- دنیا کے بڑے بڑے مذہب ——— عمادالحسن فاروقی
- زنداں کے شب و روز ——— بیگم زینب الغزالی
- تاریخ سعودی عرب ——— شیخ محمد سیات
- اسلام اور جدید سائنس ——— مولانا شہاب الدین ندوی
- ہماری دعوت ——— حسن البناء شہید
- دم واپسیں سے رحمٰن کے فیصلے تک ——— علی اصغر چودھری
- کیا ہم مسلمان ہیں ——— استاد محمد قطب
- مذہب اور تجدید مذہب ——— پروفیسر عبدالحمید صدیقی
- اسلامی عقیدہ ———

297.9921 م 28 ممن
78334-U-67

مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اُر

انسان کامل و نبی اکمل صلی اللہ علیہ وسلم

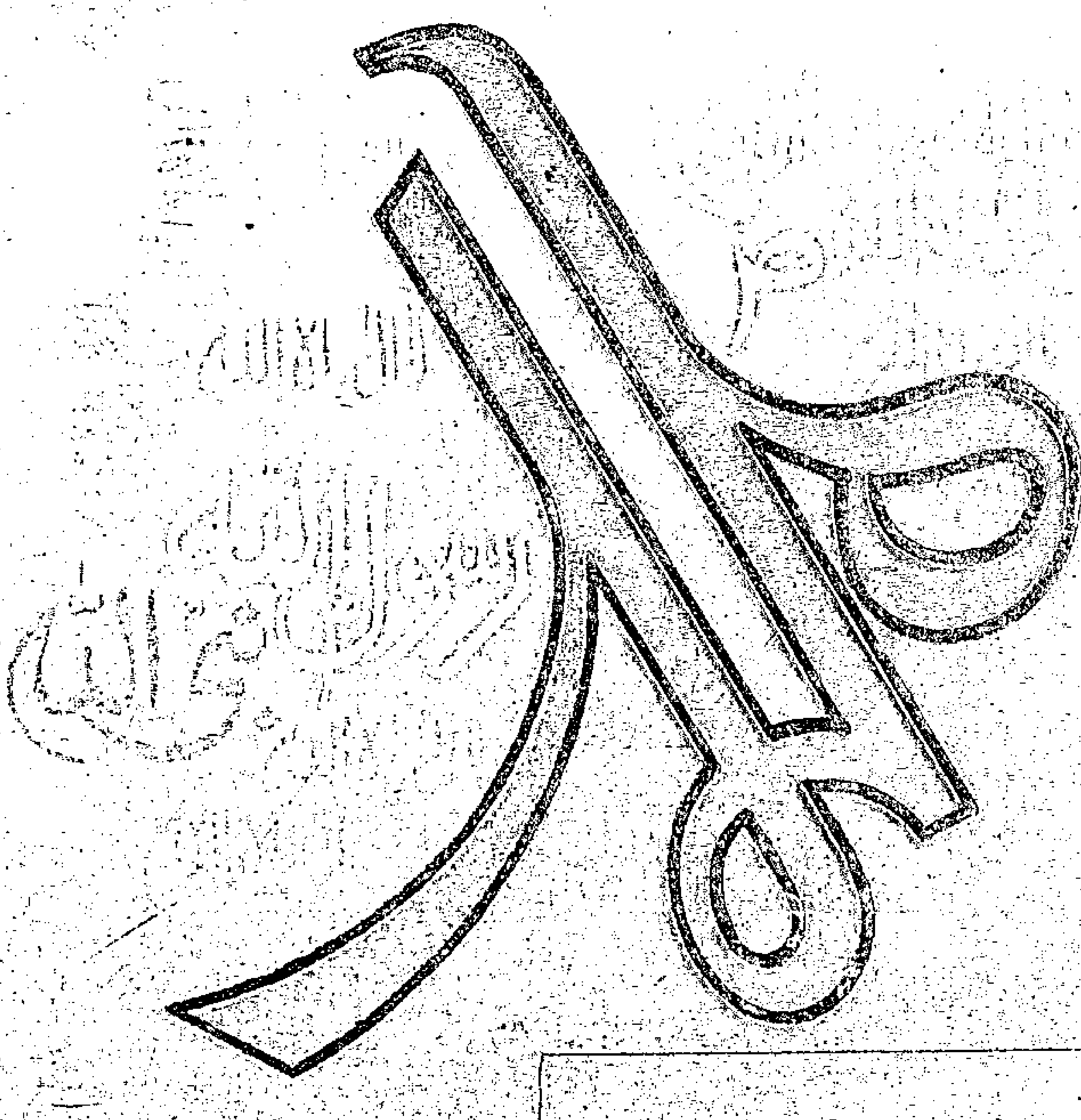

ڈاکٹر منظور ممتاز